

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تعمیر حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

شمارہ نمبر ۳

۱۰ مئی ۲۰۲۳ء مطابق ۱۹ شوال المکرم ۱۴۴۴ھ

جلد نمبر ۲۰

اس شمارے میں

۵	اداریہ ہمارے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ محمد عمیر الصدیق ندوی
۷	نشانِ راہ نعمتِ عظمیٰ کا اہل بننے کی ضرورت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
۹	قرآنی افادات ادب و تہذیب کی تعلیم کی ضرورت حضرت مولانا سید محمد رابع حسینی ندویؒ
۱۱	مشعلِ راہ تدریس و تربیت: کچھ اہم باتیں مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی
۱۴	فکر معاصر حق کبھی مغلوب نہیں ہوتا مولانا سید محمد واضح رشید حسینی ندویؒ
۱۷	فکر و نظر علم کا صحیح استعمال اور انسانی سماج مولانا بلال عبدالحی حسینی ندوی
۲۳	دین و علم نئی نسل کے لیے دینی تعلیم کا نظم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۲۵	علم و عمل مطالعہ کی اہمیت و ضرورت ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی
۲۶	اصلاح معاشرہ کام لگن اور جاں فشانی سے کیا جائے ڈاکٹر سراج الدین ندوی
۲۸	یادِ رفتگان مولانا سید محمد یحییٰ ندوی علیہ الرحمہ فیصل احمد ندوی
۳۲	فقہ و فتاویٰ سوال و جواب مفتی محمد ظفر عالم ندوی
۳۳	شعروادب آنکھوں میں رکھ لوں گندہ خضر..... رئیس الشاکری ندویؒ

سرپرست

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسینی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول
محمد عمیر الصدیق دریا بادی ندوی

نائب مدیر
محمد مصطفیٰ الحسن کاندھلوی ندوی

معاون مدیر
محمد اصطفیٰ الحسن کاندھلوی ندوی

مجلس مشاورت
مولانا عبد العزیز بھنگلی ندوی

تقریریں محترم! تعامیر حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایمیل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زراور خط و کتابت کا پتہ
TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.: 0522-2740406
website : <http://tameerehayat.com> - email : tameer1963@gmail.com
مضمون نگار کسی دانے سے ادارہ کا متعلق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400 فی شماره -/20 ایٹائی، یورپی، افریقی و امریکی ممالک کے لئے -/75\$

ذرائع تعمیر حیات کے نام سے ہائیکس اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روڈ انڈیا میں، ضرورت دیکر =/30 جھڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرنگ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون تم ہو چکا ہے، لہذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور ہی آرڈرنگ پن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، ہوبالک یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد مظاہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت و نشریات نیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اعلان خصوصی اشاعت بیاد

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

قارئین محترم! ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت علماء و طلباء، معلمین و مرہبین، مصنفین و مؤلفین، خادمین دین و ملت اور بہی خواہان ملک و قوم کے لیے ایک مثالی اور قابل تقلید شخصیت تھی، جن کی زندگی کے نقوش ہمہ جہت اور رہ روان علم و عمل اور سا لکان راہ تزیہ و احسان کے لیے مشعل راہ ہیں۔

ضرورت ہے کہ ان کی علمی، دینی، تعلیمی، تربیتی، فکری، تنظیمی اور ملی و قومی خوبیوں اور خدمات و کارناموں کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کیا جائے تاکہ زندگی کے مختلف مراحل میں وہ ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں اور دین حنیف کی خدمت میں اپنی وہی و کسی صلاحیتوں اور بالخصوص زبان و قلم کی طاقتوں کا صحیح استعمال کر کے رب کریم کے حضور سرخرو ہو سکیں۔

اسی مقصد کے پیش نظر ”تعمیر حیات“ کے آئندہ دو ماہ (جون - جولائی ۲۰۲۳ء) کے شمارے خصوصی اشاعت کے لیے خاص کیے گئے ہیں، اہل قلم متعلقین و متنبین سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی تحریریں ۲۵ مئی ۲۰۲۳ء تک بذریعہ ای میل یا ڈاک ضرور ارسال کر دیں، تاکہ یہ خصوصی شمارہ وقت معین برہسہولت منظر عام پر لایا جاسکے۔

امید ہے اہل قلم درج ذیل امور کا خیال رکھیں گے:

☆ مضامین و مقالات مختصر اور جامع ہوں۔ ☆ مضامین بطور خاص ’تعمیر حیات‘ کے لیے ہوں، اور اس میں اشاعت سے قبل کہیں اور نشر نہ کیے گئے ہوں۔

☆ تحریریں ذیل میں دیے گئے عناوین یا ان سے متعلق گوشوں پر مشتمل ہوں۔

ای میل: tameer1963@gmail.com برائے رابطہ: 6202719928, 9621540462

عناوین

● فکر بوالحسن کی آبیاری

● فکر اسلامی کی ترویج میں مولانا کا کردار

● قومی و ملی مسائل میں رہنمائی

● عالم اسلام کے حالات پر گہری نظر

مناصب اور عہدے

● ندوۃ العلماء لکھنؤ

● رابطہ عالم اسلامی

● رابطہ ادب اسلامی

● آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

● کل ہند تحریک پیام انسانیت

● دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش

● دیگر مناصب اور ادارے

حضرت مولانا کی شخصیت

● خاندانی کوائف و احوال

● نشوونما اور تعلیم و تربیت

● اوصاف و کمالات

● نقوش و تاثرات

● تزیہ و احسان اور ارشاد و تربیت

تعلیم و تدریس

● منج تدریس و تعلیم

● عربی و اردو نصابیات کی تصنیف

● افراد سازی میں نمایاں کردار

ادبی، فکری و ملی خدمات

● صاحب اسلوب ادیب و انشاء پرداز

ہمارے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ

محمد عمیر الصدیق ندوی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی وفات ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ/۱۳ اپریل ۲۰۲۳ء کو ہوئی، تب سے اب تک قریب بیس پچیس روز گزر گئے ہیں مگر اب بھی کوئی دن ان کی یادوں، ان کے ذکر اور ان کے اوصاف و کمالات کے تذکروں سے خالی نہیں جاتا، کسی ہستی گراں مایہ کی یہ پہچان نئی نہیں کہ جب وہ رخصت ہوتی ہے تو رخصت کرنے والے مدتوں محو ماتم رہتے ہیں۔ میخانہ ہستی میں جام و پیمانہ کیا محروم مے خانہ تک کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مدتوں رویا کریں گے۔ ہمارے مولانا میخانہ ندوہ کیا ملت کے سرمایہ کے نگہبان تھے۔ قوم و ملت کی اس نگہبانی کی تاریخ بیان کی جاتی رہے گی لیکن اصل تو اس روح کے جانے کا غم ہے جو مولانا کی شخصیت ہی نہیں، ان کے اس ادارہ کی بھی روح تھی جس کے بارے میں کبھی کہا گیا تھا کہ ندوہ کے قالب میں جو روح ہے اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہی ہے کہ مولانا کے قالب میں جو روح رواں تھی، اس کی بے کرائی بلکہ بے قراری کا بھی اندازہ کرنا ہم جیسوں کے لیے تو کیا، ان کے لیے بھی آسان نہیں جو ان کی خلوت و جلوت ہر جگہ ان کے ہم نفس و ہم راز تھے۔ بظاہر پر سکون، خاموش، گرمی محفل سے دور لیکن کیا روح پر فتوح تھی کہ ایک پکار بلکہ ایک اشارہ پر کہاں کہاں سے لبیک کی صدائیں بلند ہوتیں۔ ادب، جوش اور محبت کی ہر نگاہ کا ایسا مرکز اور کہاں؟ ندوہ، پرسنل لا بورڈ، رابطہ عالم اسلامی، رابطہ ادب اسلامی، تحریک پیام انسانیت، دینی تعلیمی کونسل، دارالمصنفین، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام اور بے شمار علمی و تعلیمی اداروں اور تنظیموں میں ایک سناٹا ہے اور اس سے بھی زیادہ ان بے شمار دلوں کی دنیا ویران سی نظر آتی ہے جو مولانا کے علم و رشد سے آباد تھی۔

مولانا کو عمر کی نعمت سے حصہ وافر ملا، ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی قریب دس سال بچپن کے حوالے کر دیے جائیں تو قریب پچاس سال کی ان کی زندگی مشیت الہی نے ندوہ کے نام اس طرح کردی کہ خاموشی ہو، گم نامی ہو، یا پھر شہرت اور مرجعیت ہو، ان کی زندگی کا دوسرا نام ندوہ ہی ہو گیا۔ ندوہ سے فیض حاصل کرنے والوں اور پھر انفس و آفاق میں اس کی نسبت سے مجاہدوں اور فتوحات کی داستان لکھنے والوں کی ایک طویل تاریخ ہے۔ ہمارے مولانا کے اکتسابات فیض کے سرچشمے ایک نہیں کئی تھے اور ایک سے بڑھ کر ایک تھے، اس لیے سیرابی میں بھی کمی کا شکوہ نہیں رہا، طالب علمی ہو یا معلمی، ہر جگہ ان کی بہترین صلاحیتوں کی روشنی بکھرتی رہی، درس و تدریس کے ساتھ تحریر و تصنیف میں مولانا کی مہارت بھی روز افزوں ہوتی گئی، اردو کے ساتھ عربی زبان و ادب خصوصاً عربی کی جدید صحافت کے تعلق سے مولانا کی شناخت پر البعث الاسلامی، اور 'الرائد' کی مہریں ثبت ہوتی گئیں اور حق یہ ہے کہ اردو صحافت میں 'تعمیر حیات' کے ذریعہ معاشرہ کی تعمیر میں مولانا کے طریق فکر و نظر کی صحیح سمت کی گواہی بھی ملتی رہی۔ یہ ساری خوبیوں اگر نہ ہوتیں تو شاید تعجب کا اظہار نامناسب نہ ہوتا لیکن کمال یہ ہے کہ مولانا کی تنظیمی صلاحیتوں کا اظہار جس طرح ہوتا رہا اور تنظیمی مسائل میں ان کی حکمت و مصلحت، دوراندیشی، معاملہ فہمی کا ہر نقش ان کی اصابت رائے بلکہ صلابت رائے کا شاہد بنتا گیا وہ مولانا کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے کسی روایتی کرامت سے کم نہیں کہا جاسکتا۔ ندوہ نے پہلے بھی کچھ نہایت اعلیٰ درجہ کے منتظم بلکہ مدبر دیکھے تھے، جن کے حسن انتظام کی شہرت ملک گیر تھی، لیکن ہمارے مولانا نے انتظام و انصرام میں صبر و ثبات، تحمل و برداشت اور استقامت و استقلال کی صفات کو جیسا دوام اور تسلسل بخشا اس کی توجیہ بھی بہت مشکل ہے۔ کمالات اور اوصاف کی ایسی جامعیت کے باوجود خود کو خفی و مستور رکھنے کا ہنر بلکہ حوصلہ بھی جیسا ان کو نصیب ہوا، وہ بھی ان کی جامعیت اور انفرادیت کا ایسا امتزاج ہے جس کی مثال گویا عثقا ہے۔ مولانا کی داستان زندگی سے اگر آخر کے بیس بائیس سال کے اوراق نکال دیے جائیں تو ان کی باقی ساری داستان اصلاً عکسوں کی تصویر ہے، یا پھر سایہ دیوار ہے جو ان کے مربی و معلم اور مرشد و مقتدی کی شکل میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے وجود کی برکتوں سے حاصل ہوا، ان کی زندگی حضرت مولانا علی میاں ندوی کے وجود سے ہم آہنگ ہی نہیں، اس میں ضم ہو گئی، جمال ہم نشین کو جذب کرنے کی آرزو پہلے بھی ہوتی رہی ہے کہ یہ جذب کامل ایسا ہو کہ طالب ہی کو مطلوب سمجھ لیا جائے، اسی کو سب پکارا ٹھیں، گزر جائیں جدھر ہو کر، پاکیزہ معاشروں کی داستانوں میں جذب و انجذاب کی ایسی مثالیں نایاب نہیں لیکن

ہمارے مولانا نے اپنے مربی و معز کی ذات میں جس طرح خود کو سمو اور سادیا، ایسا منظر بھی کبھی کبھی ہی نگاہوں سے گزرتا ہے۔ مولانا کے نام سے ان کے سوانح پر مشتمل کتاب 'اوراق زندگی' کے نام سے آئی، یہ خودنوشت نہ ہوتے ہوئے بھی آپ بیتی ہی ہے کہ مختلف موقعوں پر ہمارے مولانا نے اپنی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا اس کو جمع کر دیا گیا، کہنے کو یہ مولانا کی کتاب زندگی کے اوراق ہیں لیکن سطر سے اظہار صرف اس شخصیت کا ہے جو لکھنے والے کے لیے وہ مناظر نور تھی کہ بس ہر قدم صرف اس کی روشنی کا رہن تھا۔ خودنوشتوں کو پڑھنے والے عموماً لکھنے والے کی مبالغہ آرائی، شخصیت کے جذبہ اظہار اور اپنی انفرادیت کی کھلے یاد بے لفظوں میں تشریح کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی اوراق زندگی تھے کہ کہیں میں سے ملاقات نہیں ہو پائی، جو ہے وہ سایہ ہے، زندگی کسی دیوار کے سایہ میں کس طرح اور کس کامیابی سے گزاری جاسکتی ہے، ہمارے مولانا شاید یہی بتانا چاہتے تھے۔ مولانا کے اسلوب میں سچائی اور سادگی دونوں اس طرح باہم آمیز ہیں کہ دونوں سے مل کر جو رنگ بنتا ہے وہ صرف معصومیت کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنی شادی کے بارے میں بتایا کہ رشتہ کرنے کا معمول یہ تھا کہ قریبی رشتہ داروں ہی میں ہو، مولانا لکھتے ہیں کہ ایک فائدہ تو ضرور تھا کہ اس سے خاندانی خصوصیات اور موروثی صفات منتقل ہوتی ہیں، خاندانی بزرگوں نے جن اچھی باتوں کا التزام کیا، اولاد کو ان کا فائدہ پہنچتا ہے لیکن دوسری طرف اس کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اولاد میں بعض جسمانی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس سے ان کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ کوئی فلسفہ نہیں نہ جواز اور عدم جواز، الفاظ میں کوئی پیچیدگی نہیں، ایک احساس کے معصومانہ اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے مولانا کی پوری زندگی سچائی اور سادگی کے معصومانہ اظہار کی یقیناً ایسی دل آویز و دل کش شکل تھی جو ہمیشہ دیکھنے اور سمجھنے والوں کو انسانی فضائل و رذائل کا پیغام دیتی رہی اور دیکھنے والوں کو یہ کہنے پر بھی مجبور کرتی رہی کہ:

ایسی شکلیں نہ دکھائے گا زمانہ ہرگز

صاحب 'تعمیر حیات' کو یاد کر کے جام و پیمانہ مدتوں رویا کریں گے، اس کا اندازہ قریب ایک مہینے سے ان کی یادوں کے دراز ہوتے سلسلوں سے کیا جاسکتا ہے، 'تعمیر حیات' بھی اپنے سرپرست کی یادوں کی قدیل کو فروزاں کرنے کی تمنا ظاہر کر چکا ہے۔ شخصیت، اس کی زندگی، زندگی کے نشیب و فراز فکر و نظر کے بیچ و خم، انسانی مزاج و سرشت کی تعمیر پذیری، حالات و واقعات کے دباؤ اور بندشوں کا انسانی اظہار، رشتوں کے بننے اور بگڑنے کا ناگزیر عمل، ان سب کا ذکر و تجزیہ اور پھر کاروان زندگی کا ایک منزل پر ٹھہر جانا اور زندگی کے بوجھ کا کجاوہ اتار دینا، یہ سب دوسروں کے لیے، بعد میں آنے والوں کے لیے یقیناً نقوش حکمت و موعظت بن کر آنے والے کاروانوں کی اصل منزل کی جانب صحیح رہنمائی کی افادیت رکھتے ہیں 'تعمیر حیات' کے جس خصوصی شمارہ کا اعلان اس شمارے میں ہے اس میں اصحاب فکر و نظر اور اہل علم و قلم حضرات کی موجودگی کی توقع کی جانی چاہیے کہ یہ محض کسی فرد واحد کی کسی محدود دنیا کی سیر نہیں، ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے احوال و کوائف، مسائل و مصائب، مختلف اور متفرق شراکینوں کا خیر کامل کے خاتمہ کے لیے متحد ہونے کی غیر فطری کاوشوں کے مقابلہ کی سنگینیوں کو محسوس کرنا ہے، یہ محض ایک عالم کی زندگی کا مطالعہ نہیں، نہ ہی فرد واحد سے محرومی کا بیان ہے بلکہ یہ علم و حکمت اور تزکیہ و اخلاق و معاملات اور ہر مطلوب انسانی صفت کے استمرار کا عمل ہے جو ایک وجود میں کئی دنیاؤں کا پتہ دیتا ہے۔ سرپرست ندوہ 'تعمیر حیات' مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو اللہ تعالیٰ نے وہ جان عطا کی تھی جو ہر لمحہ یہ اعلان کرتی رہی کہ وہ جس جسم کی حرکت و حرارت کا سبب ہے وہ کئی جہانوں کی وسعت لیے ہوئے ہے جو اس حقیقت کا اعلان بھی ہے کہ ایک عالم کا اس دنیا سے رخصت ہو جانا اصلاً کئی جہانوں کا ویران ہو جانا ہے۔ مولانا کی رحلت پر وہ تمام الفاظ و جذبات یاد آ جاتے ہیں جو پہلے بھی ایسے سانحوں پر قلب و زبان پر جاری ہوتے رہے ہیں، ماتم کرنے والوں کا انداز جدا ہو سکتا ہے، کسی کے جانے پر تندر و سیاست کا ماتم کیا گیا، کسی کے قلم کی سحر نگاری اور ادب کی بزم آرائیوں کا مرثیہ پڑھا گیا، کہیں یہ محسوس ہوا کہ اب علم کا فقدان ہی فقدان ہے، اور کسی کے جانے پر قوم کا ماتم کیا گیا، اور بھی بالکل جدا انداز میں اولو العزماء اخلاق کی گم شدگی پر صدائے فریاد بلند کی گئی۔ ہمارے لیے مولانا کا وجود تدریجاً، شرافتِ زبان اور حرمتِ لوح و قلم، متاعِ علم کی حفاظت، اور قوم کی غم خواری و خیر خواہی سے عبارت رہا لیکن اولو العزماء اخلاق کی گم شدگی کا درد شاید سب سے بڑھ کر ہے۔

بہت پہلے کہا گیا تھا کہ یہ علمائے ندوہ کے ہاتھ میں ہے کہ ندوہ کو اس درجہ بلندی پر پہنچائیں جو اس کے شایان شان ہے، ورنہ پھر خدا نخواستہ، نا اتفاقی، غفلت، رشک، غلط فہمی سے ندوہ اسی طرح برباد نہ ہو جائے جیسے قوم کی اور تمام کوششیں نا اتفاقی سے برباد ہو جاتی ہیں، اخلاق کے مجموعہ میں فضائل و رذائل دونوں کا حصہ برابر ہے۔ ہمارے مولانا نے جس طرح مکارم اخلاق کا نمونہ پیش کیا وہ شاید ادا و سوارہ جاتا اگر اس میں رذائل سے نفرت و اجتناب کا بھی اسی درجہ خیال اور اہتمام نہ ہوتا۔ دعا ہے تو یہی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے مولانا کو جنت الفردوس میں اپنے قرب سے نوازے اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

نعمتِ عظمیٰ کا اہل بننے کی ضرورت

۱۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو طلبائے دارالعلوم کے سامنے تعلیمی سال کے آغاز پر جامع خطاب

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

دکر ہا یہاں پہنچائے جائیں، وہ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں، غرض یہ کہ جو جس طرح بھی یہاں آیا وہ اور اس کے والدین لائق تحسین و صد مبارک باد ہیں۔

مگر یہاں آپ کو کیا ملے گا؟ آپ کیا پائیں گے؟ یہ بہت وسیع موضوع ہے، جس پر مفصل روشنی ڈالنے کا یہ موقع نہیں ہے، اور نہ اتنا وقت ہی ہے، امام غزالیؒ کی ”احیاء العلوم“ اس موضوع پر بہترین کتاب ہے، آپ موقع نکال کر اس کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دینی درسگاہ میں طالب علم کو کیا کچھ ملتا ہے۔

کلامِ پاک کی نعمت

ابھی ابھی قاری جب تلاوت کلامِ پاک میں مشغول تھا تو مجھ پر صرف ایک کیفیت شروع سے آخر تک طاری رہی، اور وہ یہ کہ ہم جیسے ناپاک و نجس انسان جس کی حیثیت لاشیٰ محض کی سی ہے، وہ اور اس ذاتِ عالی کا کلام جس نے بجز ویر، آسمان و زمین، شمس و قمر کو وجود بخشا اس کا کلام سمجھ سکیں، اس کے مخاطب بننے کے مستحق بن سکیں، الہی کیا مقام ہے! وہ شخص جس کی اس صفیہ ہستی کے اوپر کوئی حیثیت نہیں، آخر وہ اس نعمتِ عظمیٰ کو پا کر دیوانہ کیوں نہیں ہو جاتا، گر بیان کیوں نہیں پھاڑ لیتا، کیا ہم اس قابل ہیں کہ خلاق عالم کے مخاطب بن سکیں! جب تک قاری تلاوت میں مشغول تھا، مجھ پر صرف یہی ایک تاثر قائم رہا، یہ (فہم قرآن) اتنی بڑی نعمت ہے کہ اگر اس پر کوئی شخص دیوانہ ہو جائے اور گریباں چاک کر کے مجنونانہ کیفیت اختیار کر لے تو کوئی تعجب انگیز بات نہیں، کیا ابی ابن کعبؓ کا واقعہ بھول گئے، ذرا

لیکن ہر مشکل کا ایک حل ہے، اور اس کا حل یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو مختلف اوقات میں آپ کے سامنے رکھا جائے۔

سب سے پہلے میں آپ سب کو مبارک باد دیتا ہوں، پرانے طلبہ کو اس لیے کہ وہ اب تک موجود ہیں، زمانے کی گردشیں، اور اس کے الٹ پھیر نے الحمد للہ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا، اور وہ اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے مقصد کے حصول میں مشغول ہیں، اور نئے طلباء کو مبارک باد اس لیے دیتا ہوں کہ انھوں نے دینی تعلیم کا انتخاب کیا، اللہ تعالیٰ کا کتنا فضل و کرم ہے کہ اس نے آپ کے والدین کو یہ توفیق دی کہ وہ آپ کو ایک دینی درسگاہ میں تعلیم کی غرض سے بھیجیں، بعض ایسے بھی طلباء ہیں، جو زبردستی بھیجے گئے ہیں، لیکن وہ بھی اللہ کے منظور نظر ہیں، حدیث شریف میں وارد ہے کہ ”جنت میں بعض لوگ ایسے بھی جائیں گے، جن کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوں گی“، یعنی وہ اللہ کے اتنے منظور نظر ہیں کہ باوجود اس کے کہ وہ خود جنت میں داخل ہونا نہیں چاہتے، ان کے بیڑیاں ڈال کر اور زبردستی داخل جنت کیا جائے گا، اسی طرح دینی تعلیم کا حصول بھی اتنی بڑی نعمت ہے کہ جو اس پر زبردستی لگائے جائیں، اور وہ بغیر اپنے مقصد کو سمجھے ہوئے جبراً

نئے سال کے شروع میں آپ سے تعارف حاصل کرنا اور اپنے تجربات بیان کرنا ایک مناسب و بر محل بات ہے، آپ سے بات کرنا مشکل بھی ہے، اور آسان بھی، ظاہر بات ہے کہ باپ جب اپنے بیٹے سے اور ایک عزیز اپنے دوسرے عزیز سے بات چیت کرتا ہے تو نہ اس کے اندر کسی تصنع و بناوٹ کی ضرورت ہوتی ہے، نہ دقیق و ثقیل الفاظ کے استعمال کی، یہی میری باتوں کی بھی حیثیت ہے، جانی بوجھی باتیں، عمر بھر کے تجربے، راستے کے نشیب و فراز، اس کی منزلیں، ان تمام باتوں کو آپ کے سامنے رکھنا، اس نوعیت کے اعتبار سے یہ بات بہت آسان ہے، اس میں مجھے زیادہ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں، اور میں کیا یہاں آپ کے اساتذہ میں جو کوئی بھی آپ سے بات کرے اسے زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاہی میں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آپ سے بات کرنا مشکل بھی ہے، اس لیے کہ میں آپ سے اتنی باتیں کرنا چاہتا ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں اور کہاں ختم کروں، باتوں کا ایک اتھاہ سمندر ہے، اور اس کے اتنے محرکات ہیں جن میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا مشکل ہے،

تاریخ کے اوراق کو الٹ کر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالئے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعبؓ سے فرمایا کہ خدا نے تمہارا نام لے کر کہا ہے کہ ان سے کلام پاک پڑھو اور سنو تو سیدنا ابی بن کعبؓ پر والہانہ کیفیت طاری ہوگئی، اور مارے خوشی کے چیخ نکل گئی، اور فرمایا: ”اُو سَمَانِي رَبِّي“ اللہ اللہ کیا حال تھا، خدا اور اس کے رسول سے محبت و وارفتگی کا جس کا عشر عشیر بھی ہمارے نصیب میں نہیں۔

میرے عزیزو! اگر یہاں آپ کو کچھ نہ ملے، سارا مال خرچ کرنے کے بعد صرف یہی ایک نعمت ملے کہ ہم خدا کے کلام کے مخاطب بننے کے اہل ہو جائیں، تو سچ جائے دنیا کی ساری لذتیں و آرائشیں سب اس ایک نعمت پر قربان، اور اس نعمتِ عظمیٰ کے ملنے کے بعد آپ کی ساری محنتیں وصول اور آپ کے والدین کی ساری کمائی حاصل۔

میرے عزیزو! یہ بات خوب ذہن میں بٹھالیجیے کہ آپ یہاں کس لیے آئے ہیں، اپنی تعلیم میں لگنے سے پہلے اپنے مقاصد کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے، آپ کس نعمت کو حاصل کرنے آئے ہیں، اس کے لیے ذہن کو بیدار کر لیجیے۔

تمہارا قصہ صرف یہی نہیں کہ تم زبردستی یہاں لائے گئے ہو، بلکہ تمہارے اور تمہارے خالق کے درمیان ایک سنہری زنجیر ہے، جس کا اگر ایک سر تمہارے ہاتھ میں ہے تو دوسرا سر اللہ رب العزت کے قبضہ میں، گویا تمہارے اور اللہ کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے، جس کی بنا پر تم اس کے کلام کو سمجھ سکتے ہو، اور اس کو اخذ

کر سکتے ہو، اس سے بات کرنے کا طریقہ تمہیں معلوم ہے۔

مدرسے کا مقصد

میں کسی بھی مدرسہ کی یہ تعریف ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ یہاں ایسی زبان سکھائی جاتی ہے جس کی بدولت عربی کتابیں پڑھی جاسکیں، اور اس سے دوسرے دنیاوی فائدے اٹھائے جاسکیں، عربی مدرسہ کی ہرگز ہرگز یہ تعریف نہیں، بلکہ وہ تو وہ جگہ ہے جہاں طالب علم کے درمیان جیسا کہ میں نے پہلے کہا، اور خدا کے درمیان ایک بلا واسطہ کی کڑی ہے، جس کا ایک سرا دھر ہے، اور دوسرا اللہ کے قبضہ میں ہے۔

ہمیں کیا کرنا ہے

میرے عزیزو! اس بات کو سمجھو کہ اس نعمتِ عظمیٰ کا اہل بننے کے لیے تمہیں کن باتوں کی ضرورت ہے، تمہیں کم سے کم کیا کرنا ہے؟ سب سے پہلے اپنے اندر شکر پیدا کرو، اکیلے میں بیٹھ کر سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں انبیائے عظام اور اولیائے کرام کے راستے پر ڈال دیا، اگر تم پھر اپنی سابقہ جگہ پر پہنچ جاؤ تو یہ تمہاری بڑی بد قسمتی ہے، اس راستے میں اولیائے کرام اور انبیائے عظام کے نقش قدم نظر آئیں گے، اور اس سب سے بڑھ کر تمہیں علم نبوت کی روشنی ملے گی۔

دوسری چیز اس مدرسہ کی زندگی میں حسب استطاعت اپنے کو اس کے مطابق بنانا ہے، ہر راہ کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، اس راہ کے تقاضے یہ ہیں کہ فرائض کی پابندی کی جائے، مثلاً نمازوں میں مستعدی، جماعت کے وقت سے پہلے مسجد آ جاؤ، نوافل و دعا کا ذوق پیدا کرو۔

تیسری چیز، اپنے اخلاق کو بھی اسی کے مطابق بناؤ، تمہارے اندر صبر، زہد، استغناء کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

چوتھی چیز، تمہارے اخلاق و آداب، طور و طریق، رہن سہن سب خالص اسلامی ہو، تمہارا منظر بھی اس راستے کے پیشواؤں کے مطابق ہو۔ مجھے خدا کی قسم تمہارے متعلق یہ خطرہ ہرگز نہیں کہ تم یہاں سے جانے کے بعد فقر سے دوچار ہو گے، خطرہ جو ہے وہ صرف اس بات سے کہ کہیں اس نعمتِ عظمیٰ کی ناقدری سے جو اللہ تعالیٰ تم کو عطا فرما رہا ہے تم پر ادا نہ آجائے اور اگر تم نے شکر ادا کیا تو اس نعمت کے شکر کے عوض تمہاری استعداد کہیں زیادہ بڑھ جائے گی: لَعْنُ شَاكِرْتُمْ لَا زَيْدٌ لَكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ“۔

لیکن جب تک تم اپنے اندر جو ہر ذاتی نہ پیدا کرو گے اور استعداد میں پختگی نہ حاصل کرو گے، اس وقت تک تم کچھ بھی نہ ہو گے، اور دنیا میں بھی جا کر تم کچھ نہ کر سکو گے۔

آخر میں اس امر کو پھر صاف صاف بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنی تعلیم شروع کرنے سے پہلے اپنے مقاصد اور اپنے مقام کو پہچانو، پڑھنا اور استعداد پیدا کرنا ہی صرف اپنا مقصود و نصب العین بناؤ، اس کے علاوہ کسی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو، ان شاء اللہ دنیا میں بھی کامیاب و بامراد رہو گے، کامیابی و شادمانی تمہارے قدم چومے گی، اور پھر اللہ رب العزت کے حضور میں حاضری کے وقت بھی سرخرو ہو گے، اللہ آپ کو کامیاب کرے، آمین۔

☆☆☆☆☆

ادب و تہذیب کی تعلیم کی ضرورت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ساتھ آواز دینے میں محتاط رہنا چاہیے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ عام انسانوں سے بالکل مختلف ہے۔

ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دیہات کے لوگوں کو مخاطب کر کے شہری لوگوں کی بھی تشبیہ کر دی کہ تم بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی نہ سمجھو، ان کا اللہ سے خاص تعلق ہے، اور اس تعلق کی وجہ سے ان کو تم پر ایسی برتری حاصل ہو گئی ہے کہ کسی اور کو وہ برتری حاصل نہیں ہے، گرچہ وہ انسان ہیں لیکن اللہ نے ان کو اپنا لیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی پوری سرپرستی فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایات دیتا ہے، فرمان الہی ہے: ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ [النجم: ۳-۴] (آپ جو بات بھی کہتے ہیں اپنے دل سے نہیں کہتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ اور رہنمائی کی بنیاد پر کہتے ہیں)۔

معلوم ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کو آپ کا کہنا نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ درحقیقت وہ اللہ کا کہنا ہوتا ہے، البتہ آپ کے واسطے سے پہنچتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست کسی کو مخاطب نہیں کرتا، اگر اللہ تعالیٰ کی بات براہ راست آئے تو اس کو انسان برداشت ہی نہیں کر سکتا، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ تھا کہ جب وحی آتی تھی تو آپ پر اتنا بوجھ پڑتا تھا کہ آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، اور آپ کی کمر جھک جاتی تھی، اگر آپ سواری پر ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پیٹھ ٹوٹ جائے گی، آپ کا گھٹنا کسی کے اوپر ہوتا تھا تو معلوم ہوتا تھا منوں بوجھ اس پر لگ گیا، لیکن اللہ تعالیٰ

ناواقفیت کی بنیاد پر تھا، لیکن بے ادبی بے ادبی ہی ہوتی ہے خواہ بری نیت سے نہ ہو، ان لوگوں کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول کے لیے ہرگز ناپسند تھا، اس لیے ان کی گرفت فرمائی، نبی کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے اس کی تعلیم دی، اور ان بدوی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی یہ حرکت ناواقفیت کی بنیاد پر ہے، انہوں نے یہ عمل اپنے مزاج کے مطابق کیا، انہیں یہ سمجھ نہیں ہے کہ وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، کس طرح بات کریں، ان کے مقابلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام کس قدر بلند ہے۔

دوسری آیت میں انہیں لوگوں کے متعلق کہا گیا کہ ان کے لیے بہتر بات تو یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے نکلنے کا انتظار کرتے، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنا صحیح بات نہیں ہے، ممکن ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی حالت میں ہوں کہ اس حالت میں ان کے لیے نکلنا نامناسب ہو، لیکن آپ پکارے چلے جائیں گے تو اس بات سے ان کو خلل ہوگا اور اذیت بھی پہنچے گی، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ گھر کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہو رہی ہو جس کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کا پکارنا مناسب نہیں ہے، اس لیے باہر سے ہر شخص کو بے تکلفی کے

”إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنَ الْهُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ، وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ“ [الحجرات: ۴-۵] (بے شک جو لوگ آپ کو پکارتے ہیں آپ کے گھروں کے پیچھے سے، ان میں سے اکثر بات کو نہیں سمجھتے، اگر یہ لوگ صبر کرتے جب تک کہ آپ خود نہ نکلتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا، اللہ تعالیٰ معاف کرتا ہے اور رحم کرنے والا ہے)۔

ان آیات میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ادب کی تعلیم دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض بدوی اپنے مزاج کے مطابق آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے باہری حصہ سے بلند آواز سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے تھے: ”اے محمد! اے محمد! باہر نکلو“ یہ وہ لوگ تھے جو گاؤں دیہات سے آتے تھے، اور اکھڑتے تھے، تہذیب نام کی کوئی چیز نہیں جانتے تھے، بڑے سے کس طرح بات کرنا چاہیے، برابر والے اور چھوٹے سے بات کرنے کا کیا طرز ہونا چاہیے، ان لوگوں کو ان آداب کا کچھ بھی علم نہ تھا، ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ دیہات کے کچھ لوگ آئے، انہوں نے باہر سے محمد محمد پکارنا شروع کر دیا تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بات سناسکیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کا یہ آواز لگانا کسی بری نیت سے نہیں بلکہ محض

نے آپ کو ایسا بنایا تھا کہ آپ اتنا بوجھ برداشت کر لیتے تھے، اگر وہی وحی کسی دوسرے انسان پر اترتی تو وہ کچل کر مر جاتا، لیکن اس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

گویا ان تعلیمات کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو اس طرح سمجھا جائے کہ ہمارے تمام معاملات میں اس کا اثر ظاہر ہو، نبی کے نام پر کسی بھی مجلس کے انعقاد کے وقت یہ احساس ہو کہ ہم کس کی بات سن رہے ہیں، کس کی مجلس میں بیٹھے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ایسی مبارک مجلسوں میں بھی شرکت ہو مگر اس کے باوجود ہم اپنے دوستوں سے ہم کلامی میں مست ہوں، یا ایسے بیٹھے ہوں جیسے اپنے کسی ہمسرے کے سامنے بیٹھے ہوں، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ سے مخصوص تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک ایسی عظمت عطا فرمادی ہے کہ آپ انسان ہیں مگر عام انسانوں کی طرح نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں ایک انسان ہوں، جس طرح لوگ کرتے ہیں میں بھی کرتا ہوں، بس یہ ہے کہ اللہ نے مجھ کو نبی بنایا ہے، یہ جو اعزاز آپ کو ملا اس سے آپ اور انسانوں سے برتر ہو گئے لیکن انسان رہے۔

مندرجہ بالا آیات میں خاص طور پر عربوں کو ہدایت کی گئی، کیونکہ عربوں کا مزاج بہت بے تکلف مزاج تھا، وہ بادشاہ سے بھی خطاب ”تم“ سے کرتے تھے، عربوں کے یہاں یہ عجم سے تہذیب آئی، جو کہ ایک اچھی تہذیب ہے کہ مختلف لوگوں کے درجے کے مطابق ان سے

معاملہ کرنا چاہیے، عرب بادشاہ سے یوں مخاطب ہوتے تھے جیسے کسی عام انسان سے، مثلاً: ”اے بادشاہ! تمہیں ایسا کرنا چاہیے“، بعض سادہ لوح عربوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا، لیکن عموماً یہ حال تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی نہیں، یعنی ہمت نہیں پڑی کہ آپ پر کھلی نگاہ ڈال لیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر معمولی رعب تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں کی اس عادت کے مطابق خطاب کرنے والے کچھ نئے لوگ تھے، یا انہیں پرانے لوگوں میں ایسے تھے، جو زور سے بات کرنے لگے، پکارنے لگے، اس لیے کہ کثرت کے ساتھ رہنے میں بے تکلفی ہو جاتی ہے، لہذا ہدایت دے دی گئی کہ ان سے اپنی آواز اونچی نہ کرو، بلکہ ان کی بات سنو، وہ تمہارے معلم ہیں، تمہارے ہادی ہیں، تمہیں ان سے کچھ لینا ہے، ان کی اطاعت کرنی ہے، ان سے برابری کا معاملہ نہیں کرنا ہے۔

ان آیات میں گھر کے باہر سے پکارنے کے متعلق جو بات کہی گئی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہی تھا، مگر یوں بھی عام انسانوں کے ساتھ بھی اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے، بسا اوقات ہمارے معاشرہ میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کسی کے دروازے پر زور زور سے پکارتے رہتے ہیں، نہ جانے وہ شخص اندر کس حالت میں ہو، لیکن باہر والا شخص اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا، جب کہ یہ بدتمیزی کی بات ہے کہ انسان اندر

سے کوئی جواب نہ ملنے کے باوجود مستقل آواز لگاتا رہے، ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان باہر کھڑے ہو کر جواب کا انتظار کرے یا ان کے نکلنے کا انتظار کرے، جن سے ملنا ہے ان کے وقت کو دیکھے کہ ان کا کون سا وقت خالی ہے، اس وقت ان سے بات کرے، سچی بات یہ ہے کہ آج یہ اسلامی تہذیب مسلمانوں کے درمیان سے اٹھ رہی ہے، مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ انہیں اس سلسلہ میں کوئی پرواہ نہیں ہوتی، صرف اپنے کام سے کام رہتا ہے، دوسرا آدمی کس حالت میں ہو اس کا کوئی خیال نہیں ہوتا، بغیر کسی جھجک کے اندر گھستے چلے آتے ہیں، جس پر بعض وقت اندر والے شخص کو شرمندگی بھی ہو جاتی ہے، اندر والا شخص کپڑے پہن رہا ہو، یا استنجاخانا میں ہو، یا اپنے کسی اور ذاتی کام میں مصروف ہو، اور کوئی دوسرا شخص باہر سے ان کو آواز دے چلا جائے یا بغیر اجازت اندر گھستا چلا آئے یہ سب غیر اسلامی طریقے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس ادب کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا، تاکہ تمام لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کے ساتھ چھوٹے بڑوں کے فرق کو بھی سمجھ سکیں، کس موقع پر کیا بات کہی جائے، کس موقع پر کس کو اپنی ضرورت بتائی جائے، کس موقع پر آدمی کو بلایا جائے ان سب چیزوں کا خیال پیدا ہو سکے، اگر ان سب چیزوں کا خیال پیدا نہیں ہوتا تو پھر آدمی بے خیالی میں نہ جانے اپنے کن کن طریقوں سے لوگوں تکلیف پہنچاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مشعل راہ

تدریس و تربیت: کچھ اہم باتیں

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی

یہ کہ دنیاوی علوم کا نفع دینی علوم سے کہیں زیادہ ہے، دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ایک انسان وسیع النظر اور وسیع الفکر بنتا ہے، اور دینی علوم کے ذریعہ محدود فکر اور تنگ نظر بنتا ہے، اس قسم کی بہت سی بدگمانیاں ہیں جن سے ایک طالب علم کو واسطہ پڑ رہا ہے۔

ایک صحیح الفکر مدرس اور عالی ظرف استاذ کی مثبت فکر ہونی چاہیے، کہ وہ دین اور عقل کے درمیان جوڑ اور ہم آہنگی پیدا کرے، اس لیے کہ دین ہی انسان کو طلب علم پر آمادہ کرتا ہے، بل کہ دین علم کو اپنا خادم سمجھتا ہے، اور علمائے راسخین کو دینی خدمات کا حق دار سمجھتا ہے، کہ وہ اس وسیع کائنات میں اللہ تعالیٰ کی قدرتی نشانیوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ایک عالم اپنی حسن ذکاوت، وسیع معلومات، اور راسخ علم کی روشنی میں کائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کر سکتا ہے، وہ اللہ جو کائنات کے نظام کو پوری باریکی اور حسن تدبیر کے ساتھ چلا رہے ہیں، اور کائناتی نظام کے ذرہ ذرہ کو دیکھ رہے ہیں، جس کی طرف قرآن کریم نے یوں اشارہ کیا ہے: "إن فی خلق السموات والأرض واختلاف الليل والنهار لآیات الأولى الألباب"۔ [سورہ آل عمران]

ایک کامیاب استاذ، اور مدرس کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنا درس پڑھا دے یا گھنٹہ کی تکمیل کر دے؛ بل کہ استاذ دوسرے معنی میں مربی ہے جو اپنے تدریسی عمل سے پوری نسل تیار کرتا ہے، وسیع النظر اور کثیر المعلومات عالم تیار کرتا ہے۔ جس کی نگاہ کائنات کے نظام اور انسانی فطرت کی حقائق پر ہو، اشیاء کے فطری مزاج اور

واخلاقی قدروں اور علم کے حقیقی معانی و مفاہیم کو منتقل بھی کر سکے گا، اور حقیقی معنی میں مربی کہلانے کا مستحق بھی ہوگا کہ وہ طالب علم کی علمی قابلیت و صلاحیت پر بھی نظر رکھ سکے گا، اور عقلی و فکری سرگرمیوں پر گرفت بھی، اور خیر خواہ اور فکر مند مربی و معلم وہی ہو سکتا ہے جو طالب علم کو یہ یقین دلائے کہ حقیقی سعادت مندی تعلیم و تعلم ہی میں ہے، اور ایک کامیاب انسان ہی علمی میراث و قابلیت کا صحیح مستحق ہو سکتا ہے، اور علم کو اس کی اپنی صحیح جگہ استعمال کر سکتا ہے، یعنی اعلیٰ مقاصد کے لیے علمی قابلیت و صلاحیت کو استعمال کرے، اور وہ ہے صحیح زندگی کی قیمت پہچاننا، اللہ تعالیٰ کے احکام کا مطیع و فرماں بردار بنانا، زندگی کی حقیقی سعادت اور آخرت کی کامیابی کا مستحق بننے کے لیے ایک مربی عالم اپنی حسن تدریس سے دلوں میں ایمانی قوت کو راسخ کر سکتا ہے، ایمان کامل اور علم حقیقی کے درمیان ربط پیدا کر سکتا ہے، اس لیے کہ علم ہمیشہ دین و ایمان کا حقیقی خادم رہا ہے، علم حقیقی ہی بندہ اور خدا کے درمیان حقیقی تعلق پیدا کر سکتا ہے، وہ تعلق جو واضح دلائل، اطمینان بخش براہین کی بنیاد پر قائم ہے، جو طالب علم کے دلوں سے شکوک و شبہات، اور ادنیٰ درجہ کی خلش کو بھی دور کر دے۔ وہ شکوک و شبہات اور بدگمانیاں جو عام طور پر ذہنوں میں جگہ پکڑ گئے ہیں، کہ دنیاوی علوم و فنون دینی علوم کے لیے رکاوٹ بن رہے ہیں، یا

قدیم زمانہ میں لفظ تدریس تعلیم کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا، اور نہ درسگاہیں مدارس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں، بل کہ مصر میں تعلیم گاہ کو "بیت العلم" کے نام سے جانا جاتا تھا، جب تعلیم کا مفہوم عام ہوتا گیا، اور تعلیم میں ترقی ہوئی تو تربیت کا پہلو بھی اس میں شامل کیا گیا، تو یہ الفاظ "دراسة، دراسات" تعلیم کے میدان میں عام ہوتے گئے، اور جب یہ الفاظ تعلیم کے باب میں شامل کیے جانے لگے، تو تدریس ایک فن کی شکل اختیار کر گئی، جو آج تک مختلف مناج اور اسالیب کی شکل میں ترقی کرتا جا رہا ہے، اور تعلیم و تربیت اور تہذیب و ثقافت کے مختلف اسالیب پر مشتمل ہے، اور تدریسی مراحل اور تربیتی پہلوؤں کو خالص اسلامی روح اور دینی مزاج سے ہم آہنگ کر رہا ہے، اس لیے کہ تدریس سے صرف تدریسی مواد کی تعلیم مقصود نہیں ہے، بل کہ طالب علم کو تعلیم و ثقافت، آداب و سلوک، اور عطر بیز سیرت سے مزین کرنا بھی شامل ہے، جب استاذ تعلیمی و تربیتی امور میں ان بنیادی چیزوں کا لحاظ رکھے گا، طالب علم کو نئی معلومات اور علمی آداب سے مزین کرے گا، تعلیمی مراحل کی تسہیل کرے گا، اور معاشرتی زندگی میں تعلیمی و تربیتی مراحل کو عام کرے گا تو یقیناً یہ استاذ ایک حقیقی مربی اور مخلص معلم ہوگا، اور ایک ذی اثر روحانی پیشوا بھی ثابت ہوگا، اور اپنے زیر تربیت طلباء میں دینی

ان کے آپسی تعلقات سے واقف ہو۔ انسانوں کا اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق ہو، اس کو گہرائی سے دیکھنے والا ہو، اس کی پوری فکر ایمان کامل اور علم راسخ سے منصف ہو، دونوں میں سے کسی ایک ہی کا نہ ہو، ایمان کا انکار کرے اور نہ علم سے ہاتھ دھو بیٹھے، بل کہ ہر ایک کو اس کا اپنا مقام دے، حقائق کی تدریس اور دلوں کو اس کی طرف مائل کر کے ایک طاقتور رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔ بل کہ زندگی کی تکمیل بغیر درس و تدریس کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے بغیر درس گاہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایمان اور علم کے درمیان کی مسافت، انسانی زندگی کے حقائق جان کر ہی طے کی جاسکتی ہے۔ اور جب انسان ان حقائق کو جانے گا، تو بدگمانیاں خود بخود زائل ہو جائے گی۔

لیکن یہ بات اسی وقت ہو سکتی ہے جب پختہ ایمان والی نسل تیار ہو، اور ایسا عالم ہو جو ہمہ جہتی مضبوط معلومات رکھے، انسان اور خدا کے درمیان کے رشتہ کو خوب سمجھتا ہو، کائنات اور خدا کے رشتہ کی حقیقت کو جانتا ہو، حقیقی اور صحیح عالم وہ ہے جو اپنی ذمہ داری کی پاسداری کرے اور تدریس میں ان امور کا خیال رکھے۔

۱۔ طلبہ کی صحیح علمی رہنمائی مقصود ہونے کہ اپنی علمی نمائش۔

۲۔ تدریس میں اپنے مقصود کو فراموش نہ کرے اور تدریسی امور سے صحیح مثبت نتائج اخذ کرے۔

۳۔ طلبہ کے سامنے اشکالات پیش کرے اور انہیں سوال کرنے کا عادی بنائے، تاکہ وہ تدریسی ذمہ داری کو سمجھ سکیں، اور اشیاء کی حقیقت

کا صحیح ادراک بھی کر سکیں۔

۴۔ طلبہ کو زیادہ علمی معلومات حاصل کرنے میں صحیح مشورہ دے اور ان کو اپنی حقیقت یاد دلائے اور اپنے اساتذہ کی سرپرستی و تربیت میں خوب ذاتی محنت کرنے پر ابھارے۔

اس لیے کہ موجودہ زمانہ میں حصول تعلیم کا مسئلہ مکمل طور پر طالب علم کی ذاتی محنت اور لگن پر منحصر ہے۔ وہ اپنے آپ کو پورا ذمہ دار ٹھہرائے، اساتذہ کی حیثیت تو صرف اشراف اور سرپرست کی ہونی چاہیے، اس سے زیادہ نہیں، جیسا کہ ”طریق تدریس“ کے دو موقر مصنف شیخ صالح عبدالعزیز، اور عبدالعزیز عبدالجید نے لکھا ہے کہ موجودہ طرق تدریس کا مقصد یہ ہے کہ ان مواقع اور مشکلات کو واضح کیا جائے، جن سے طالب علم کا براہ راست تعلق ہے، تاکہ اپنی ذات سے مشکلات اور مسائل کے حل کا کامیاب طریقہ سوچ سکے، اور صحیح فکر کا حامل ہو، اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب طالب علم، تعلیم و تعلم کے صحیح مصادر اور سرچشمہ کے حصول پر پورے انہماک، اخلاقی قدروں، اور فطری صلاحیتوں کے ساتھ متوجہ ہو، اس لیے کہ ہر طالب علم اپنی فطری ذاتی لگن اور محنت کے ذریعہ تعلیمی میدان میں پیش رفت کر سکتا ہے۔ [التربیۃ وطرق التدریس: ص ۱۹۷] ایک صحیح الفکر اور راسخ العقیدہ استاذ اپنے تدریسی عمل میں یقیناً ان باتوں کا بھی لحاظ رکھے گا۔

۱۔ طالب علم زندگی کے معاملات میں دوسروں کے ساتھ اخلاقی و محبتانہ برتاؤ کرے، تاکہ لوگ اس کے قریب ہونے لگیں۔

۲۔ طالب علم اپنی فکری صلاحیت اور علمی استعداد کو خوب پروان چڑھائے، تاکہ ایک باوقار و سنجیدہ طالب علم شمار کیا جاسکے۔

۳۔ طالب علم اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرے، خود غرضی نہیں، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے اہل تعلق میں باہمی تعاون اور اخلاقی برتاؤ کرے۔

۴۔ طالب علم کی مشکلات سے استاذ براہ راست واقف ہو، تاکہ ان کا صحیح حل تلاش کیا جاسکے۔ استاذ کے حسن اخلاق میں سے یہ بھی ضروری ہے، کہ وہ طلبہ سے استمراری تعلق و ربط رکھے، تاکہ وہ اپنے معاشرتی، دینی مشکلات میں استاذ سے رہنمائی و مشورہ حاصل کرتا رہے اور اس لیے بھی کہ استاذ کی جانب سے طالب علم کی فکری عملی تربیت ہوتی رہے، اور اس لیے بھی کہ تکبر اور خود ستائی کا شکار نہ ہو سکے۔ استاذ کا اپنے شاگرد کے ساتھ تعلقات کی استواری، بہت سے مسائل و مشکلات کا حل ہے کہ طالب علم استاذ سے تعلیمی تربیتی معاملات میں تعاون لے سکتا ہے، اور استاذ اس شاگرد کے ساتھ نفسیاتی برتاؤ کے ساتھ تدریسی معاملات میں ہر ممکن تعاون کر سکتا ہے، اس برتاؤ سے شاگرد پختہ باکمال اتالیق اور مربی بن سکتا ہے، اور اپنی مستقبل کی زندگی میں ایک کامیاب رہنما بھی بن سکتا ہے۔

اس زریں اور بیش بہا موقع پر ہم اس بات کو ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو ہارون رشید نے اپنے بیٹے محمد امین کے اتالیق اور استاذ سے اپنے بیٹے کی تربیت کے بارے میں کہی تھی، جس کو ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں یوں ذکر کیا ہے۔

اے احمد! بیشک امیر المؤمنین نے تمہارے پاس اپنا جگر بھیجا ہے، اپنے دل کا پھل تمہارے حوالہ کیا ہے۔ اس کو اپنی تربیت میں لے لو، امیر کی اطاعت تمہارے لیے واجب ہے، تم محمد امین کے

ساتھ اس انداز سے پیش آؤ جس مقصد کے خاطر امیر المؤمنین نے اس کو تمہارے سپرد کیا ہے۔ قرآن کی تعلیم دو، اشعار عرب اخبار احوال سے باخبر کرو، آداب و سنن سے مزین کرو، موقع کلام سے مطلع کرو، زیادہ ہنسی سے باز رکھو، ہاں بر محل ہنسی سے کوئی مضائقہ نہیں، بنی ہاشم کے مشائخ کے احترام و اکرام سے مطلع کرو۔

اور ایسا کوئی وقت نہ گزرے جس میں وہ تم سے فائدہ نہ اٹھا سکے، حتی المقدور اپنی تربیت سے محمد امین کو درست کرو، اگر تم نے اس کی صحیح تربیت نہ کی تو یقیناً محمد امین کے والدین تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کریں گے۔ [حلیۃ الاولیاء: رقم: ۶۲۵، یہ حدیث غریب اور سفیان ثوری سے مروی ہے]۔

امام غزالیؒ نے بھی اپنے انداز سے طلبہ کے حق میں معلمین و مدرسین کے آداب ذکر کئے ہیں، جن کا ذکر کرنا یہاں موضوع کے مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱- طلبہ کے ساتھ شفقت کا معاملہ کریں، ان کو اپنی اولاد کا درجہ دیں۔

۲- تدریس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کریں، طلبہ کے افادہ میں کسی اجرت اور بدلہ کے خواہاں نہ ہوں، اور نہ شکر گزاری کے طلب گار، بل کہ طلبہ کو خالص اللہ کی رضا جوئی اور اس کے تقرب کے خاطر تعلیم دیں، اور نہ طلبہ پر کوئی تدریسی احسان جتلائیں، بل کہ ان کے دلوں کو یقین کریں کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوں، اور ان کے دلوں میں علم کا بیج بویں۔

۳- طالب علم کو نصیحت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں، استحقاق سے پہلے کسی علمی مرتبہ کے خواہاں نہ ہوں، طلبہ کو بتائیں کہ طلب علم

سے مقصود اللہ کا قرب ہے، نہ کہ منصب طلبی اور دوسروں کے مقابلہ میں فخر و مباہات سے پرہیز کریں، تنافس سے نہیں کہ وہ مطلوب ہے۔

۴- طالب علم کو اس کے برے اخلاق پر متنبہ کریں، کنایہ اور شفقت کے ساتھ، نہ کہ سرزنش اور ڈانٹ کے ذریعہ، اس لیے کہ صراحت، ہیبت و رعب کے حجاب کو ختم کرتی ہے، اور طالب علم اپنے استاذ کے خلاف جرأت اور اختلاف کا عادی بنتا ہے، اور حرص انسان کو اصرار پر آمادہ کرتی ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "لَوْ مُنِعَ النَّاسَ عَنْ فَتِّ الْبُغْرِ لَفَتَّوْهُ" (اگر لوگوں کو تماش کے پتے ملانے سے منع کیا جائے تو وہ اصرار املائیں گے)۔

۵- طالب علم کے دلوں میں ان علوم سے متعلق برائی نہ بٹھائے، جو وہ حاصل نہیں کر رہا ہے، جیسے لغت کا استاذ فقہ کے متعلق طالب علم کو بدگمان نہ کرے، فقہ کا استاذ طالب علم کو حدیث و تفسیر سے دور نہ کرے، علم کلام کا استاذ فقہ کے طالب علم کو متفرق نہ کرے، یہ اساتذہ و مربی کے اخلاق سے بہت گری ہوئی بات ہے؛ بل کہ استاذ کو چاہیے کہ طالب علم کی بتدریج تربیت کرے، تمام علوم سے اس کو متعارف کرائے، کہ وہ کسی بھی فن اور علم سے بدگمان نہ ہو۔

۶- طالب علم کو اس کے فہم و ذکا کے مطابق تربیت دی جائے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ أُمِرْنَا أَنْ نَنْزِلَ النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ وَنُكَلِّمَهُمْ عَلَى قَدْرِ غُضُوْلِهِمْ" (ہم انبیاء اس بات کے مکلف کئے گئے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ ان کے مقام و مرتبے کے اعتبار سے معاملہ کریں، اور لوگوں سے ان کی

عقلوں کے مطابق کلام کیا کریں)۔ [المطالب العالیۃ مؤلفہ حافظ ابن حجر، کتاب الادب، باب العقل وفضلہ: رقم: ۲۸۲۴]

۷- استاذ طالب علم کی ہمت کو پست نہ کرے کہ یہ تو بہت دقیق اور گہرا علم ہے، یہ طریقہ طالب علم کو علم سے دور بھی کر سکتا ہے اور اس کی ہمت کو پست بھی، علم سے متعلق اس کا ذہن تشویش کا شکار بھی کر سکتا ہے، طالب علم اپنے استاذ سے متعلق یہ خیال بھی کر سکتا ہے کہ وہ میرے ساتھ علم کے باب میں بخل کر رہے ہیں، استاذ طالب علم کی ہمت کو بڑھائے، اس کی ڈھارس باندھے، کہ وہ ہر علم کا اہل اور مستحق ہے، کوئی علم دقیق اور گہرا نہیں ہے، محنت اور ہمت سے ہر علم حاصل کیا جاسکتا ہے، مقصد تو اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے۔

۸- استاذ اپنے علم کے مطابق عمل کرنے والا بھی ہو، اس کا فعل اس کے قول کی تکذیب نہ کرتا ہو، علم بصیرت سے حاصل کیا جاسکتا ہے، اور عملی نگاہوں سے وجود میں آتا ہے اور ظاہر ہے کہ ظاہری نگاہ والے اہل بصیرت کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ اس لیے کہ اگر ہر چیز سے متعلق یہ کہا جائے کہ اس کے قریب نہ جاؤ، اس کو استعمال نہ کرو، یہ زہر ہے تو لوگ اس کا تمسخر کریں گے، اس کا استہزاء کریں گے، اور اس کو مہتمم ٹھہرائیں گے، اور یہ حقیقت ہے کہ منع کی ہوئی چیز کی طرف لوگوں کا میلان زیادہ ہوتا ہے۔

ٹیڑھی لکڑی کا سایہ سیدھا کیسے ہو سکتا ہے، نا تجربہ کار، اور بد اخلاق استاذ سے ایک صحیح الفکر طالب علم تربیت نہیں پاسکتا ہے۔

ترجمانی: عبدالرحمن ملی ندوی

☆☆☆☆☆

حق کبھی مغلوب نہیں ہوتا

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

تاریخ میں ایسے بھی حکمراں خاندان دیکھنے کو ملتے ہیں جنہوں نے صدیاں در صدیاں حکمرانی کی، کسی نے تین صدی تو کسی نے مکمل پانچ صدیوں تک حکومت میں قبضہ جمائے رکھا، لیکن پھر سنت الہی کے مطابق اس حکومت کا بھی تانا بانا بکھر گیا اور دوسرے خاندان اس حکومت پر قابض ہو گئے، حکمراں خاندانوں کے اقبال وادبار کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور زمام مملکت جن خاندانوں کے پاس رہی انہوں نے فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کیا، دشمنوں کو زیر کیا، تہذیب و تمدن، ثقافت اور علم و فن کے ادارے قائم کئے، دوسری حکومتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا، یورپین حکام اور ترک عثمانی حکمرانوں (سلطان سلیمان اور سلطان سلیم) کے مابین ہونے والی مراسلت پر جن کی نظر ہے وہ سلطنت عثمانی کی وسعت، اس کی شان و شوکت، اس کی عظمت و ہیبت اور رعب و دبدبہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں، لیکن تاریخ نے کروٹ بدلا اور ترک عثمانیوں کا دور اقتدار ختم ہو گیا، دوسری نئی طاقتیں غالب آگئیں۔

مسلمانوں نے دنیا کے مختلف براعظموں پر جن میں یورپ اور افریقہ بھی ہیں حکومت کی، دنیا کے تمام خطے جہاں اسلام کے قدم پہنچے وہاں آج بھی اسلام کے اثرات باقی ہیں، خواہ اسلامی حکومت ہو یا غیر مسلموں کا غلبہ ہو، ان میں سرفہرست سرزمین اندلس (اسپین) ہے جو غداروں کی غداری اور خاندانوں کی خیانت داری کی نذر ہو گئی اور پھر عیسائیوں نے ان کے ساتھ وحشیانہ اور بہیمانہ معاملہ کیا، ان پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے اور جبراً انہیں اندلس چھوڑنے پر مجبور کیا، انسانی حقوق کے ساتھ ایسا کھلاڑ کیا اور ایسی دھجیاں اڑائیں جس کی نظیر تاریخ میں نہیں

آ رہا ہے کہ اگر کسی قوم کا ستارہ اقبال طلوع ہوا تو کسی کا غروب، چنانچہ مسلمانوں نے دنیا کے بڑے وسیع رقبہ پر صدیوں حکومت کی، ان میں سے کسی نے نصف صدی تک حکومت کی تو کسی نے ساٹھ سال تک اپنا لوہا منوایا ہے، جیسا کہ ایک فاطمی حکمراں نے ساٹھ سال تک حکومت کی، اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زیر نگیں افغانستان سے لیکر آسام تک کا علاقہ تھا، اس طویل مدت میں ان کی حکومت میں کسی طرح کا جھول اور کسی طرح کی کمزوری دکھائی نہیں پڑتی، مسلمانوں نے اپنے عہد اقتدار و غلبہ میں علم و فن کی بے شمار شمعیں روشن کیں اور کارہائے نمایاں انجام دیئے، زندگی کے ہر میدان میں ایسی ایسی تابغہ روگار اور عبقری شخصیتوں کو وجود بخشا جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، اس چمن کا ہر پھول اپنے اندر اپنی ایک انوکھی شان رکھتا ہے، اس میں کوئی حکیم ہے تو کوئی فلسفی، کوئی ریاضیات کا امام ہے تو کوئی فلکیات کا معتقد، ابن سینا، بیرونی، ابن رشد، رازی، ابن بیثم، مسکویہ اور ان کے علاوہ سیکڑوں عظیم اسلامی شخصیات گزری ہیں جن کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی، ان کا اپنا ایک امتیاز اور ایک ایجاد ہے، رہتی دنیا تک کے انسان ان کے ایجاد کردہ علوم و فنون کے مرہون منت رہیں گے، آج کی تمدن و دنیا انہی مسلم حکماء و فلاسفہ کے علمی و سائنسی اصول و مبادی اور افکار و نظریات کی روشنی میں ترقی کے منازل طے کر رہی ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی قوم رو بہ زوال ہوتی ہے، اس کے درخشندہ و تابندہ نقوش مٹنے لگتے ہیں، اس کے افراد میں بے چینی، اضطراب اور شکایتیں عام ہونے لگتی ہیں، قائدین اور حکمرانوں پر سے قوم کا اعتماد اٹھنے لگتا ہے، سیاسی، اقتصادی اور سماجی ڈھانچہ بکھرنے لگتا ہے اور ایسے مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں جن کے حل سے قوم عاجز ہو جاتی ہے، تو ذہنوں میں اس قوم کی صلاحیت و بقا کے متعلق شکوک و شبہات جنم لینے لگتے ہیں، اس کے درخشاں اور روشن عہد کو لوگ بھلا دیتے ہیں، ہر طرف سے وہ ہدف ملامت بن جاتی ہے اور بوڑھے شخص کی طرح چوہرہ مصائب کا شکار ہو جاتی ہے، انسان کی طرح تو میں بھی خواہ کتنی ہی ترقی یافتہ اور خوشحال ہوں، غلبہ و قوت اور اقبال و عروج کی اپنی آخری منزل کو پہنچ کر زوال و پستی، انتشار و تفرقہ اور انحطاط وادبار کا شکار ہو جاتی ہیں اور ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور دوسری قومیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ قرآن کریم اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”و کم اھلکنا قبلہم من قرن ھل تحس منہم من أحد أو تسمع لہم رکزاً“ [سورہ مریم: ۹۸] (اور ہم نے ان سے پہلے بہت سے گروہوں کو ہلاک کر دیا ہے، بھلا تم ان میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا) (کہیں) ان کی بھنک سنتے ہو؟۔

جس طرح کسی قوم کے ارتقاء و اقبال مندی کے کچھ اسباب ہوتے ہیں اسی طرح اس کے زوال کی بھی کچھ دواعی ہوتے ہیں، ازل سے یہ دستور چلا

ملتی حتی کہ یہ تصور کیا جانے لگا کہ اسلام کا خاتمہ ہو گیا ہے، اس کی عمر تمام ہو چکی ہے، اور سرزمین اندلس کلی طور پر مسلمانوں سے خالی ہو گئی ہے۔

لیکن صلیبی ظلم و قہر کے باوجود اسپین میں موجود اسلامی آثار، پڑوسی عربی ممالک کے کام کرنے والے مسلمان اور بعض اعتدال پسند اسپینی حکمرانوں کی کشادہ قلبی اور رواداری کی وجہ سے ایک بار پھر اسلام کی واپسی کے آثار نظر آنے لگے ہیں، تازہ رپورٹوں کے مطابق اسپین میں اسلام کی ترقی روز افزوں ہے، روز بروز نو مسلموں کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے، ہماری امیدوں میں اس وقت اور تیزی نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے تئیں اسپینی حکام رواداری کا رویہ اختیار کر رہے ہیں، ابھی حال ہی میں اسپین کی راجدھانی مڈریڈ میں شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز آل سعود کی سرپرستی میں ”بین المذاہب ڈائلاگ“ کے عنوان کے تحت ایک عالمی کانفرنس منعقد کی گئی، اور اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں اسپینی حکام اور مسیحی قائدین نے بھرپور تعاون کیا، اگر مسلمان حکمت و دانائی، موعظت حسنہ، اور نبوی طریقہ دعوت سے کام لیتے رہے تو فریقین میں آپسی کدورت کا خاتمہ ہوگا، تعلقات مزید استوار ہوں گے، فاصلے اور دوریاں کم ہوں گی اور نزدیکیاں اور قربتیں بڑھیں گی، تاریخ بھی یہی بتاتی ہے اور عدل و انصاف بھی اسی کا متقاضی ہے، لہذا ایک نہ ایک دن مظلوم کو غلبہ نصیب ہو جاتا ہے اور ظالم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اسپین کے طرز پر جہاں اسلام تمام تر ریشہ دوانیوں کے باوجود اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ عود کر رہا ہے، اس پر آنا ہوا غبار خود بخود چھٹ رہا ہے، لوگوں کے مشرف بہ اسلام ہونے کا

سلسلہ عروج پر ہے، مساجد و مدارس کا قیام عمل میں آ رہا ہے، اسلامی نقوش و آثار کو نئی زندگی مل رہی ہے اور عظیم اسلامی ہستیوں کے علوم و فنون اور ان کی علمی تحقیقات کا اعتراف کیا جا رہا ہے، ایشیاء وسطیٰ اور مشرقی یورپ میں اسلام، دشمنوں کی عداوتوں اور مخالفتوں کے باوجود منصفانہ شہود پر ایک بار پھر جلوہ گر ہو رہا ہے اور اپنی ضیاء پاش کرنوں سے دنیا کو منور کر رہا ہے، مشرقی یورپ میں پابندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود اسلام کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، اور یہاں اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں، حالانکہ اس سے پہلے یہاں کمیونزم کا دور دورہ تھا، کمیونزم ہی نے عیسائیوں کو اسلام دشمنی پر آمادہ کیا اور اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ بھی نہیں چھوڑا ہے، بلکہ کمیونزم دوسرے اعداء اسلام کے مقابلہ میں اسلامی شناخت اور اسلامی تشخص کو مٹانے بلکہ اسلامی وجود کو ختم کرنے میں بڑھ گیا تھا۔

وہ سپر پاور (سوویت یونین) جس نے پورے عالم کو اپنے سامنے پیشانی خم کرنے پر مجبور کر دیا، پوری دنیا سے چین و سکون کا جنازہ نکال کر بدامنی، بے چینی کی فضا قائم کر دی اور عالم اسلام کے مختلف خطوں کے مسلم باسیوں سے آزادی چھین لی اور ان کی گردنوں میں غلامی کا طوق ڈال دیا، انسانی حقوق کی ایسی پامالی کی گئی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی، مشرق میں مصر، عراق، شام اور افریقہ میں الجزائر، لیبیا، سوڈان، اور صومالیہ میں قیامت صغریٰ برپا کر دی گئی، ظلم و استبداد کے ایسے دلدوز مناظر سامنے آتے ہیں جس سے روح کانپ جائے، انسانی دماغ چل جائے، لیکن یہ طاقت بھی ٹوٹ کر بکھر گئی، ان وحشیانہ جرائم کے مرتکبین یورپین نصرانی تھے جن کی اسلام دشمنی محض قومی، دینی

اور نسلی بنیادوں پر تھی، انہوں نے انسانی حقوق کی ساری حدوں کو پار کر دیا، خدا کے فضل سے مسلمان اس خطرناک آزمائش سے نکل آئے، اور از سر نو کوششیں شروع کر دی ہیں، اخباری رپورٹوں سے دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام کی مقبولیت کا پتہ چل رہا ہے اگر ایک طرف مدارس کھولے جا رہے ہیں تو دوسری طرف اسلامی مراکز اور عبادت خانے تعمیر کئے جا رہے ہیں، مسیحی مبلغین اور اہل کلیسا کا کہنا کہ کلیسا کے مقابلہ میں لوگوں کے دلوں میں مساجد کی وقعت و اہمیت زیادہ موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی مذاہب اختیار کی جا رہی ہیں جس سے دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت رک سکے، اسی مقصد سے بہت سی دشمنی تحریکیں و تنظیمیں شب و روز اسلام کی شبیہ بگاڑنے کے لیے کوشاں ہیں۔

یورپ میں مسلمانوں کی مظلومیت کی ایک مکمل داستان ہے، یورپی اقوام کے عہد اقتدار میں مسلمانوں پر ظلم و ستم، وحشیانہ اور بربریت اور سفاکیت کے جو پہاڑ توڑے گئے، وہ افریقہ و امریکا میں سیاہ فاموں پر کئے گئے مظالم سے کئی گنا زیادہ ہیں، سفید فاموں کے ہاتھوں سیاہ فاموں کا قتل عام تاریخ میں درج ہے۔

ہندوستانی مورخ امریش مشرانے لکھا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں نے اپنے عہد اقتدار کے میں دس لاکھ سے زیادہ ہندوستانیوں کو موت کی نیند سلا دیا، جن میں زیادہ تر مسلمان تھے، فرانس نے الجزائر میں ایک ملین سے زیادہ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، یہ تو جہتے دریا کے چند قطرے ہیں، پورے یورپ نے اسلامی ملکوں میں ایسی بھیانک خون آشامیاں کی ہیں جس سے انسانیت کا سرشرم سے جھک جاتا

ہے، ابھی حال میں یورپ کے زیر کنٹرول مختلف علاقوں میں اجتماعی قبروں کا انکشاف ہوا ہے، ان وحشیانہ جرائم کی تازہ مثال بوسنیا، ہرزے گوینا، سیرائیفو اور کوسوو کی ہے جہاں مسلمانوں کا صفایا کر دیا گیا، مسلم اکثریت والے علاقوں کو تقسیم کر دیا گیا، مسلم آبادی کو منتشر کر دیا گیا، مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا، ان کی عزت و ناموس کو پامال کیا گیا، مسجدیں منہدم کر دی گئیں، مسلمانوں کی روشن اور بے داغ تاریخ کو مسخ کر دیا گیا اور ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور مظلومین ہی کو ملزم کے کٹ گھرے میں کھڑا کیا گیا، اور پھر اس قتل عام کو جائز قرار دیدیا گیا، اسلئے کہ ظالم طاقتور تھا، اور طاقتور ہی کی آواز سنی جاتی اور اس کے عذر کو قبول کر لیا جاتا ہے، مظلوم و کمزور کی اولاً تو آواز ہی سنی نہیں جاتی، اور اگر سنی بھی لی گئی تو اس کے عذر کو قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔

ان یورپی ظالموں نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق بے بنیاد اور سراسر جھوٹ پر مبنی کہانیاں گڑھیں تاکہ ان کے کالے کرتوتوں کی نمائش نہ ہو سکے، اپنے جرائم اور وحشیانہ کارروائیوں کے جواز میں ایسی بے بنیاد کتابیں لکھ ڈالیں، جنہوں نے ذہنوں کو مسموم کر کے رکھ دیا، اور ظالم کو معصوم اور مظلوم کو ظالم بنا دیا، جن میں ظالم مودب نظر آتا ہے، لیرے، خان اور مکار، شرفاء نظر آتے ہیں۔

اگر ہم سامراجی دور کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں یورپ کا دجل و فریب صاف نظر آئے گا، بہت سے کم پڑھے لکھے اور یورپ کی حقیقی تاریخ سے ناواقف قلم کار اس مغالطہ کا شکار ہوئے اور یورپ کو موجودہ دنیا کا معلم و مودب سمجھ بیٹھے، انسان کو پیسے اور طاقت کے زور پر اپنا ہمنوا بنا لیا جاتا ہے، اس کا مشاہدہ عام طور سے ان

علاقوں میں ہوتا ہے جہاں راہزن، اور لیرے قیام پذیر ہوتے ہیں اور وہ قافلوں پر، راگیروں پر حملہ آور ہوتے ہیں، قتل و غارتگری، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کرتے ہیں، اور لوٹا ہوا مال رشہ داروں، عزیزوں، قرابت داروں، اور اپنے موبدین میں تقسیم کر دیتے ہیں، چنانچہ یہ بے چارے ان ظالموں کو شریف النفس خیال کرتے ہیں اور ان کی طاقت اور سخاوت و فیاضی کے گن گانے لگتے ہیں، اسی طرح ان یورپی ظالموں نے کمزور قوموں پر حملے در حملے کئے، ان کے اقتصادی نظام کو ملیا میٹ کر دیا، ان کے خزانوں پر زبردستی قابض ہو گئے، اور پھر دنیا کے ہمدرد اور مسیحا بن گئے، لیکن اب ان کا عہد اقتدار رو بہ زوال ہے جس کے آثار بالکل نمایاں ہیں، اس سے پہلے روسی سامراج کا خاتمہ ہو گیا، بڑی بڑی استعماری طاقتیں کمزور ہوئے بسی کا شکار ہو گئیں، کمیونزم کا قلعہ منہدم ہو گیا، مظلوم قومیں (جن میں سرفہرست مسلمان ہیں) غلامی سے آزاد ہو گئیں۔

سویت یونین سے پہلے دنیا کا سپر پاور برطانیہ تھا جس کے زوال کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور یہ مشہور تھا کہ مملکت برطانیہ میں سورج غروب نہیں ہوتا، آج بھی وہ یہ دعویٰ کر رہا کہ وہی مملکت عظمیٰ ہے، لیکن حقیقت میں آج وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے، اور موجودہ عالمی طاقتیں بھی رو بہ زوال ہیں جو اپنی مادی اور جنگی طاقت اور ابلسی نظام کی بنا پر اقوام عالم پر حکمرانی کر رہی ہیں، اور دوسری قومیں اپنی گردنوں سے غلامی کا طوق اتار رہی ہیں۔

تنگ نظری اور عقلی و فکری انحراف کی وجہ سے نسلوں کا عقیدہ بگڑ گیا ہے، جب دکتے ستارے ان کو نظر آتے ہیں تو وہ ان کو معبود سمجھ بیٹھتی ہیں،

اور بھول جاتی ہیں کہ ظلم کو دوام نہیں ہے، ان کو حق نظر نہیں آتا، جس وقت یہ طاغوتی طاقت ختم ہو جائے گی تو ان پر حقیقت منکشف ہو جائے گی، مکرو فریب، کذب و افتراء چند ایام کے مہمان ہوتے ہیں، زمانہ دراز ہوتے ہی حقیقت آشکارہ ہو جاتی ہے: ”وقد مکروا مکرمہم وعند اللہ مکرمہم، وإن کان مکرمہم لتزول منہ الجبال“ [سورہ ابراہیم: ۴۶] (اور انہوں نے (بڑی بڑی) تدبیریں کیں اور ان کی سب تدبیریں خدا کے ہاں لکھی ہوئی ہیں، گو وہ تدبیریں ایسی غضب کی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں)۔

موجودہ تہذیب کی نمایاں خصوصیات مکاری، عیاری، جعل سازی، دھوکہ بازی اور بے وفائی ہے، زندگی کے ہر میدان میں (سیاست ہو یا تعلیم، معاشیات ہو یا ذرائع ابلاغ) تہذیب جدید کی انہی خصوصیات کا دور دورہ ہے، لیکن مکاری پھر مکاری ہے اس کا زوال یقینی ہے۔

کہا جاتا ہے اور سچ بھی یہی ہے کہ مستقبل اسلام کا ہے، اس لیے کہ اسلام دین حق ہے اور حق کبھی مغلوب نہیں ہوتا، بلکہ اس کو اتنی بلندی نصیب ہوتی ہے کہ وہ ہمدوش ثریا ہو جاتا ہے، لیکن یہاں ایک دوسری حقیقت ہے جو انسانی تاریخ سے ماخوذ ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ مستقبل ہمیشہ مظلومین کا ہوتا ہے، اور ظالم کا زمانہ بہت تھوڑا ہوتا ہے، صدیوں سے بیچارہ مسلمان مظلوم ہے اور مظلوم کا حق یہ ہے کہ اس کو غلبہ نصیب ہو، اس کے سارے حقوق واپس کیے جائیں، عدل و انصاف تو اسی کا تقاضہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال ہو، اس کی شرافت و عظمت.....

بقیہ صفحہ ۲۲ پر

علم کا صحیح استعمال اور انسانی سماج

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

انسانی سماج کے لیے علم کی اہمیت آج ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، لیکن اس کا آوازہ سب سے پہلے اسلام نے بلند کیا، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی وحی میں علم کی طرف توجہ دلائی گئی اور پڑھنے کا حکم دیا گیا اور قلم کا تذکرہ کیا گیا، ارشاد ہو:

”اَقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ“ [العلق: ۱-۵] (پڑھئے اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے بنایا، پڑھتے جائیے اور آپ کا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دین اسلام میں علم کی خاص اہمیت ہے، لیکن علم کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا رشتہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام کے ساتھ مربوط ہو، یہی وجہ ہے کہ اس امت کا علم سے بہت گہرا و مضبوط تعلق رہا ہے، علوم و فنون کے استحکام و ترقی کی شاہ کلید تو قرآن مجید کی یہ پہلی آیت ہے جس سے وحی کا آغاز ہوتا ہے، سب سے پہلے اس میں پڑھنے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور قلم کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تعلم کی بڑی اہمیت بیان فرمائی ہے، بدر کے قیدیوں کا یہی فدیہ متعین کیا گیا تھا کہ ان میں جو پڑھے لکھے ہوں وہ بچوں کو تعلیم دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو عبرانی اور دوسری زبانیں سیکھنے کا بھی حکم فرمایا

تھا، تمام مذاہب میں اسلام نے علم کی اہمیت جس طرح اجاگر کی ہے اور اس کو طاقت بہم پہنچائی ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس کا عشر عشر پیش کرنے سے قاصر ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور ہی سے علم کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے جو بنیادیں فراہم کیں، بعد میں اس پر بڑے بڑے محلات اور فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح دنیا کو علم سے بھر دیا اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب یا مکتب فکر میں نہیں ملتی، اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ اس نے صحیح بنیادوں پر علم کو آگے بڑھایا، اور اس کے ساتھ عظمت رب شامل کی، پہلی ہی وحی میں ”اَقْرَأْ“ (پڑھئے) کے ساتھ ”بِاسْمِ رَبِّكَ“ (اپنے رب کے نام سے) کی شرط لگادی گئی تاکہ انسان بے مہار نہ ہو اور علم کا استعمال بے جا نہ ہو سکے۔

عرصہ دراز تک تمام علوم کی زمام مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی، اور انسانیت کو ان علوم سے کما حقہ نفع حاصل ہوتا رہا، کیونکہ ان کے پاس علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ وہ احکامات بھی تھے، جن میں انسانیت کا درس دیا گیا ہے، اور وہ نظام اخلاق بھی تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا عکس ہے، تاریخ میں آتا ہے کہ جس وقت بغداد میں مسلمانوں کی حکومت تھی، وہاں خدمت خلق کے لیے بڑے بڑے ہاسپٹلس قائم تھے، انہیں میں ایک بہت بڑا ہاسپٹل ”بیمارستان“ کے نام سے تھا، اس میں مختلف ڈیپارٹمنٹس قائم

تھے، انہیں میں ایک ایسا ڈیپارٹمنٹ بھی تھا، جس میں باقاعدہ کچھ لوگوں کو اس غرض سے رکھا جاتا تھا کہ وہ مریض کے کمرہ کے آس پاس بیٹھ کر اس کے متعلق ایسی باتیں کریں جن سے اس کو نفسیاتی طور پر تقویت حاصل ہو، لیکن آج اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے، اب حالت یہ ہے کہ اگر کوئی مریض ڈاکٹر کے پاس Checkup کے لیے جائے، تو بجائے اس کے کہ رپورٹ دیکھنے کے بعد ڈاکٹر تسلی کے چند کلمات کہے، اس کو سخت تشویش میں ڈال دیتا ہے، بسا اوقات ایسے سخت کلمات بھی زبان سے کہہ دیتا ہے جن کو سن کر مریض کی طبیعت میں اچانک گراوٹ پیدا ہو جاتی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ علم ہے لیکن علم کی روح نہیں ہے، ٹیکنالوجی میں انسان آسمان کی بلندیوں کی طرف جا رہا ہے مگر اخلاق میں اس کی سطح بعض مرتبہ جانوروں سے بھی نیچے نظر آتی ہے، چونکہ مسلمانوں کے پاس علم کے ساتھ اخلاقی نظام بھی تھا، اس لیے ان کے یہاں ایسی سوہان روح حرکتیں نہیں تھیں، بلکہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ علم کو زیادہ سے زیادہ اخلاقیات سے مربوط کیا جائے، تاریخ میں اس قبیل کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جن کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے علم کو کس حد تک ترقی دی تھی اور عالم انسانیت کو اس سے کس قدر فائدہ پہنچا تھا۔

علم نافع یا غیر نافع

حاصل یہ کہ جب تک مسلمانوں کے ہاتھ میں علم رہا اس وقت تک علم ساری دنیائے انسانیت کے لیے باعث رحمت تھا، مسلمانوں نے علم کے ذریعہ صرف یہی نہیں کہ محض علمی فائدہ اٹھایا، بلکہ تجرباتی طور پر انسانیت کو بیش قیمت تحفے دیئے، اخلاقی طور پر اس کے لیے ایسے حدود قائم کئے جس

کی بنیاد پر کوئی شخص علم کا Misuse نہ کر سکے، یعنی اس کا غلط استعمال نہ ہو، اس کی افادیت کے دروازے بند نہ کئے جائیں، اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے:

”من کتم علما تلحم بلحام من نار“ [صحیح ابن حبان: ۹۵] [جو علم کو چھپائے گا اس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی]۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہر علم نافع ہے، کوئی بھی علم غیر نافع نہیں، لیکن علم غیر نافع اور مضر اس وقت ہوتا ہے جب وہ ان ہاتھوں میں پہنچ جائے جو اس کا غلط استعمال کرتے ہوں، ان کے غلط استعمال سے اس علم کے نامناسب مظاہر معاشرہ میں رونما ہوتے ہیں، پھر یہ کہا جاتا ہے کہ علم نقصان پہنچاتا ہے، حالانکہ علم نقصان نہیں پہنچاتا، علم فائدہ ہی پہنچاتا ہے، لیکن جو لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں اس سے فرق پڑتا ہے، کوئی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے، کوئی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے نقصان پہنچاتا ہے، کوئی اس سے خود بھی نقصان اٹھاتا ہے اور ساری انسانیت کو نقصان پہنچاتا ہے، اور کوئی اس سے نہ خود فائدہ اٹھاتا ہے، نہ فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔

آگ جلاتی ہے اس کا علم اپنی جگہ مفید ہی ہے، مگر کوئی اس کا استعمال کھانا پکانے کے لیے اور چراغ روشن کرنے کے لیے کرتا ہے، فائدہ اٹھاتا ہے اور فائدہ پہنچاتا ہے، اور کوئی اس کا استعمال کسی کا گھر جلانے اور کسی کو تباہ کرنے کے لیے کرتا ہے، علم اپنی جگہ مفید تھا مگر اس کے غلط استعمال نے اس کو بگاڑ دیا، پانی سے پیاس بجھتی ہے، ایک انسان اس کا علم رکھتا ہے مگر وہ خود نہ اپنی پیاس بجھاتا ہے، اور نہ دوسرے کی پیاس بجھنے دیتا ہے، البتہ یہ نافعیت دنیا کے اعتبار سے بھی ہے، اور آخرت کے

اعتبار سے بھی، دنیا و آخرت کی کامیابی کے طریقے اس سے معلوم ہوتے ہیں، پھر آدمی ان طریقوں سے فائدہ نہ اٹھائے، اور دوسروں کو نہ بتائے تو ایسے ہی علم سے پناہ مانگی گئی ہے:

”اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع“ [سنن ابن ماجہ: ۲۵۸] (اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو فائدہ نہ دے)۔

علم کا کام فائدہ پہنچانا تھا، اب اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے اور اپنی زندگی کی گاڑی اس کی روشنی میں صحیح رخ پر نہ لائی جائے تو ایسے علم کا کیا حاصل؟..... اس لیے اس علم سے پناہ مانگی گئی ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ جن مسلمانوں نے علم سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا، اور پوری انسانیت کو ایسے تحفے دیے جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، آج انہیں مسلمانوں نے علم سے اپنا رشتہ توڑ لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ علم ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جو اخلاق سے نا آشنا تھے، انسانیت کے درد سے نا واقف تھے، صحیح فہم سے دور تھے، جن کو اس بات کا بھی شعور نہ تھا کہ ایک انسان کے اندر کیسا دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے، آپس میں کیسی محبتیں ہوتی ہیں، اور ایک انسان دوسرے انسان کو فائدہ پہنچا کر کیسا سکون محسوس کرتا ہے، یہ سب وہ چیزیں ہیں کہ علم جن قوموں کے ہاتھ میں گیا وہ ان تمام باتوں سے ناواقف تھیں، یہی وجہ ہے کہ گرچہ ان قوموں نے علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی، مگر ان علوم کو اخلاق کی وہ روشنی نہ ملی جن سے انسانیت نوازی کا کام ہوتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی بنیاد پر ایسے بم ایجاد کیے گئے جن سے پوری انسانیت خطرہ میں ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ ان بموں میں سات مرتبہ دنیا تباہ کرنے کی صلاحیت ہے۔

دیگر مذاہب کی علم سے دوری

بعثت سے پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے مذاہب بھی علم سے کوسوں دور تھے، عیسائیت، یہودیت یا بعض دوسرے ایسے خود ساختہ مذاہب جن کی کوئی حقیقت نہ تھی، ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مذاہب میں علم کا فقدان تھا، آج یہودی اور عیسائی سب سے زیادہ ترقی یافتہ و تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں، تعلیم کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں ہے، واضح رہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ سے نہیں تھی، بلکہ تاریخ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے پورا یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، خود مغربی مفکرین اپنے اس جاہلی دور کو Ages Dark (تاریک صدیاں) سے تعبیر کرتے ہیں، رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے:

”پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیا تک ہوتی جا رہی تھی..... اٹلی اور فرانس جیسے شہروں میں طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔“

[عروج و زوال کا اثر، صفحہ: ۳۸، بحوالہ کتاب [The Making Of Humanity]

یہ وہ زمانہ تھا جس میں ان کے پاس علم کی کوئی روشنی نہیں تھی، یہ آخری درجہ کی بات ہے کہ ان کو اپنے مذہبی لوگوں (پوپ یا پرہت) کی طرف سے علم حاصل کرنے کی کوئی اجازت نہ تھی، ان کی علم دشمنی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ان میں کوئی شخص علم حاصل کرتا تو اس کو سخت سزائیں دی جاتیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے یہاں کسی قسم کا علم موجود نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اگر ان

لوگوں میں کوئی شخص بیمار ہو جاتا تو اس کو کسی جنگل میں یہ سمجھ کر ڈال دیتے کہ اگر اس کو اچھا ہونا ہے تو اچھا ہو جائے گا، ورنہ مر جائے گا، گویا علم سے دوری کے سبب ان کے پاس ایسا کوئی طریقہ علاج نہ تھا جس سے وہ مریضوں کا علاج کر سکیں، یہ دین اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں کو پہلے دن سے علم کی طرف توجہ دی، جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے علم میں ترقی کی، اور مختلف علوم و فنون وجود میں آئے۔

تاریخ سے نوافقت کا نتیجہ

موجودہ دور میں تاریخ سے واقفیت نہ رکھنے والے طبقہ کی سوچ یہ ہے کہ یورپ کو یہ ترقیاں شروع سے حاصل رہی ہیں، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ہر میدان میں تمام علوم کی کمان مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، اس لیے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی ہی وحی میں علم سے رشتہ مضبوط کرنے کا حکم دیا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بے شمار علوم وجود میں آئے، جن کا شاید اس سے پہلے دنیا نے تصور بھی نہ کیا ہو، امویوں اور عباسیوں کے زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سائنس، طب، جغرافیہ، ریاضیات، فلکیات وغیرہ نہ جانے کتنے علوم جن سے ساری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے، ان میں مسلمانوں نے بنیادی طور پر ایسی معلومات فراہم کی تھیں، یا الفاظ دیگر مسلمانوں نے ان کی ایسی بنیادیں رکھی تھیں کہ آج فلک بوس عمارتیں انہیں بنیادوں پر تعمیر ہو رہی ہیں، اور دنیا کی آنکھیں ان سے خیرہ ہو رہی ہیں، لیکن دنیا اس حقیقت سے واقف نہیں کہ یہ عمارتیں کن بنیادوں پر تعمیر کی جا رہی ہیں، جب کہ خود مغربی مفکرین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر مسلمانوں نے علوم میں ترقی نہ کی ہوتی، ہمیں یہ بنیادیں نہ دی ہوتیں، تو

ہم کم از کم تین سو سال پیچھے ہوتے، اس اعتراف کی روشنی میں اگر آج سے تین سو سال پہلے کی حالت کا جائزہ لیا جائے، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آج کے مقابلہ میں سچھٹی صدیوں میں نہیں بلکہ چند سال قبل تک دنیا ترقی کی راہوں سے کس قدر دور تھی، آج ہر جیب میں موبائل نظر آتا ہے، پچیس یا پچاس سال پہلے کی بات ہے کہ کسی شخص کے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی جیب میں موبائل ہوگا، اسی طرح اس سے بھی پہلے کا زمانہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت دنیا مزید پیچھے تھی، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ علوم میں ترقی نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے ان لوگوں کو بعض قرآنی آیات میں اشکال پیدا ہوا، جو ہر چیز کے سمجھنے میں عقل کو مقدم رکھتے ہیں، مشہور ہے کہ سر سید احمد خاں مرحوم کو اس سلسلہ میں ایک بہت بڑی غلط فہمی ہوئی کہ قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

”وَلَسَلَيْمَانَ الرِّيحُ غَدُوًّا وَهَذَا شَهْرٌ رَوَّاحُهُهَا شَهْرٌ“ [سبا: ۱۲] (اور ہم نے) سلیمان کے لیے ہوا (کو مسخر کیا) اس کا صبح کا سفر بھی ایک مہینہ (کی مسافت) کا ہوتا تھا اور شام کا سفر بھی ایک مہینہ (کی مسافت) کا۔

یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام مہینہ کی مسافت گھنٹوں میں طے کر لیتے تھے، سر سید احمد خاں مرحوم کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی، لہذا اس کا انکار کر بیٹھے، لیکن جب اس کے بعد جہاز ایجاد ہوا، تو لوگوں نے یہ بات کہی کہ کاش آج سر سید مرحوم زندہ ہوتے اور لمبی مسافت کو کم وقت میں طے کرنے کی یہ عملی شکل ان کے سامنے آجاتی تو شاید وہ اس کا انکار نہ کرتے۔

منحوس ترین دن

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ جس وقت عیسائیوں کے ہاتھ میں علم

کی کمان گئی شاید وہ دن دنیا کے لیے منحوس ترین دن تھا، جس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی علم کے دشمن تھے، اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کے یہاں حصول علم کی مذہبی طور پر سخت ممانعت تھی، یہ آخری درجہ کی بات ہے کہ جب ان میں کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہوتا کہ وہ علم حاصل کر رہا ہے تو اس کو زندہ جلادیا جاتا، اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر کسی مرے ہوئے شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی، تو اس کی قبر سے ہڈیاں نکال کر جلانی جاتیں، تاکہ تمام لوگوں کو عبرت حاصل ہو، لیکن چونکہ عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے مستقل شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے ان کے بادشاہ لوئس نهم نے مصر کے قید خانہ میں اپنی قوم کو یہ وصیت لکھی کہ اگر مسلمانوں سے مقابلہ کرنا ہے تو اس کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ علم کے میدان میں ترقی کی جائے، اور اس کی کمان اپنے ہاتھ میں لی جائے، چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں اس وصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے بعض مفکرین نے اپنے مذہبی پیشواؤں سے حصول علم کی اجازت لی، جن میں ریمان لول (Raman Lul) اور روجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۹۴-۱۲۹۴ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اجازت لینے کے بعد حصول علم کے لیے اندلس گئے، اور پھر جو کچھ انہوں نے سیکھا وہ لے کر آئے اور اپنی قوم میں انہوں نے اس کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا نظام و قانون ہے کہ جو قوم محنت کرتی ہے، اس کو اس کا صلہ دیا جاتا ہے، عیسائیوں نے علم پر محنت کی اور مسلمانوں نے اس سے بے اعتنائی برتی، اس لیے رفتہ رفتہ علم کی کمان ان ہاتھوں میں پہنچ گئی جن کا تعلق صرف علم سے تھا، اخلاقیات سے نہیں، کیونکہ ان لوگوں نے علم کو اللہ کے نام ساتھ مربوط نہیں کیا تھا،

اور یہ علمی ترقی مذہب دشمنی کے ساتھ مربوط تھی، حکومت و کلیسا کی طویل کشمکش اور بالآخر مذہب کی شکست کے بعد ترقی کا سلسلہ آگے بڑھا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم تمام دنیا کے لیے راحت کا ذریعہ بننے کے بجائے انسانیت کے لیے نقصان کا سبب بن گیا، یہ الگ بات ہے کہ اس علمی ترقی کی بنیاد پر دنیا کو بہت سی راحت کی چیزیں بھی حاصل ہوئیں، لیکن اسی کے ساتھ علم کا غلط استعمال بھی ہوا، اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ اخلاق و انسانیت سے خالی تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایٹم بم ایجاد ہوئے، اور ان کا غلط استعمال کیا گیا، جاپان کے دو شہروں میں ایسے مہلک بم پھینکنے گئے کہ کئی لاکھ لوگوں کی جان گئی، انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں اس حادثہ کا مفروضہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کئی کروڑ لوگوں کی جان بچانے کے لیے پانچ لاکھ لوگوں کی جان لی گئی، گویا اگر وہاں بم نہ گرایا جاتا تو ممکن تھا کہ بہت لوگ مر جاتے، لہذا ایک شک کی بنیاد پر کئی لاکھ لوگوں کی جان لینا مناسب معلوم ہوا۔ (العیاذ باللہ)

موجودہ نصاب و نظام تعلیم

افسوس کی بات یہ ہے کہ وہی نظام تعلیم جو ہر طرح کے اخلاق و انسانیت سے عاری ہے آج ساری دنیا میں رائج ہے، حالانکہ یہ سامراجی نظام کی یادگار ہے، برطانیہ اور فرانس کے سامراجی دور میں انہوں نے اپنے جس نظام اور نصاب تعلیم کو مشرقی ملکوں میں تھوپا تھا، آج افسوس کی بات یہ ہے کہ ظاہری طور پر سامراج ختم ہونے کے باوجود بھی اکثر ملکوں میں وہی نظام جاری ہے، ان ملکوں کو اس بات کی قطعاً کوئی فکر نہیں کہ وہ خود اپنا نصاب تعلیم تیار کریں، اپنی آزادی کا ثبوت دیں، ہمارے ملک ہندوستان کی بھی یعنی یہی صورت حال ہے، یہاں کے باشندوں کو اب تک یہ ہوش نہیں کہ وہ اس ملک کی تہذیب، یہاں کے قد و

قامت کے لحاظ سے ایک نصاب تعلیم تیار کریں، ایسا نظام تعلیم ترتیب دیں جو اس ملک کے لیے مناسب حال ہو، جس میں انسانیت و اخلاق کی قدریں ہوں، اور اس نظام میں ڈھلنے والا ایک اچھا انسان بن سکے، اس سے بڑھ کر افسوس ان مسلمان ملکوں پر ہے، جہاں اس سلسلہ کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، جب کہ اس کی ضرورت نہ جانے کب سے محسوس ہو رہی ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے نہایت پر زور طریقہ پر اس ضرورت کو پورا کرنے کی دعوت دی، جگہ جگہ یہ بات کہی کہ آج مسلمان ملکوں اور تمام مسلمانوں کے اوپر یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا نظام و نصاب تعلیم تیار کریں، ایسا نصاب تعلیم جو ان کے عقائد و اخلاق کے مناسب حال ہو، تاکہ کسی بھی طرح کی آپسی کشمکش پیدا نہ ہو، اس لیے کہ جب کشمکش پیدا ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں صلاحیتیں ضائع ہوتی ہیں، عالم اسلام کے حکمراں طبقہ اور عوام میں کشمکش پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب نظام تعلیم کی خامیاں اور کمزوریاں ہی ہیں، جو آج تک ان ملکوں میں پائی جاتی ہیں، افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اس ملک میں بھی وہی خامیاں موجود ہیں، ضرورت اس بات کی تھی کہ موجودہ نصاب تعلیم میں بعض ایسی تبدیلیاں کی جائیں، جو اس ملک کے لیے مفید ہوتیں، مگر طرفہ تماشہ یہ کہ آج یہاں کے نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی کوششیں جاری ہیں، جو تبدیلیاں اس ملک کے لیے سخت خطرہ بن سکتی ہیں، اس کا ڈر ہے کہ اس کے نتیجے میں یہاں کی آبادی کے اندر آپس میں ایک ایسی خلیج پیدا ہو جائے جس خلیج کو پانا نہ جاسکے، اور اس کی وجہ سے ملک کی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو نظام اور نصاب تعلیم مرتب کیا جا رہا ہے، اس میں ایسی ہی چیزیں مزید داخل کی جا رہی

ہیں جس کے نتیجے میں بڑا انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر مسلمانوں کی ہے کہ وہ ایسا نصاب تعلیم تیار کریں جو یہاں کی آبادی کے لحاظ سے موزوں ہو، خاص طور پر مسلمانوں کے عقائد اور نظام اخلاق و عبادات کے اعتبار سے مکمل ہو، ایک طرف اس کا پڑھنے والا زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، دوسری طرف وہ پورا مسلمان بھی ہو، یعنی عقائد مضبوط ہوں، اخلاقیات سے واقف ہو، اس کے بعد خواہ وہ انجینئر بنے یا ڈاکٹر، یا اس کے علاوہ کسی بھی شعبہ زندگی کو اختیار کرے، اس کا طرہ امتیاز یہی ہو کہ وہ سب سے پہلے ایک پختہ مسلمان ہو، اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر وہ تمام صلاحیتیں بھی موجود ہوں جو اعلیٰ سے اعلیٰ اسکول میں تعلیم پانے والے کے اندر ہو سکتی ہیں، تاکہ علم اور اسم الہی کے مضبوط تعلق کے اس خلا کو پر کیا جاسکے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے، لیکن آج مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بچے ہندوؤں یا عیسائیوں کے اسکولوں اور کالجوں میں جاتے ہیں، جہاں ان کے عقیدہ کو کھوکھلا کیا جاتا ہے، دیو مالائی نظام پڑھایا جاتا ہے، اسی لیے موجودہ حالات میں مسئلہ صرف عمل کا نہیں رہ گیا، بلکہ مسئلہ عقیدہ کا ہے، آج مسلمان بچوں کو عقیدہ کے اعتبار سے ایسی مہلک باتیں بتائی جا رہی ہیں، اور عملی طور پر ایسی شکلیں اختیار کرائی جا رہی ہیں، جن کے بعد ان کو مسلمان کہنا بھی مشکل ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حالات میں اپنا نصاب تعلیم تیار کیا جائے، اسلامک اسکول قائم کئے جائیں، چونکہ یہ کام دیر طلب ہے، لہذا ہر مسلمان کے لیے فوری طور پر ضروری ہے کہ وہ طے کر لے کہ ہمارے جو بچے اسکولوں یا کالجوں میں جا رہے ہیں، ان کو دینیات کی

تعلیم دلانا ہے، یعنی عقائد کی اصلاح کے لیے، قرآن مجید پڑھانے کے لیے، دینی تعلیم دینے کے لیے صبحی و مسائی مکاتب کا انتظام کرنا ہے، یہ ہمارے اوپر ایک ایسا فریضہ ہے کہ اگر خدا نخواستہ ہم نے فوری طور پر اس کو ادا نہ کیا تو اس بات کا ڈر ہے کہ ہماری آنے والی نسل عقیدہ کے ارتداد کا شکار نہ ہو جائے، موجودہ حالات میں مسئلہ عملی یا فکری ارتداد کا نہیں بلکہ عقیدہ کے ارتداد کا ہے، آج عیسائی اسکولوں میں جانے والے مسلمان بچوں کے ذہن و دماغ میں یہ بات راسخ کرائی جا رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے اور خدائی میں شریک تھے، ہندو اسکولوں میں جانے والے بچوں کو دیو مالائی نظام پڑھایا جا رہا ہے، اسی سچ پران کی تربیت بھی کی جا رہی ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم ان تمام باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

غفلت کا نتیجہ

ایک صاحب جو بڑے دین دار ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ ہماری بچی اسکول میں جاتی تھی، ایک مرتبہ اسکول لے جانے کے لیے رکشہ نہیں آیا، ہم اپنی گاڑی سے اس کو اسکول چھوڑنے گئے، راستہ میں ایک مندر گذرا، جس کو دیکھ کر اچانک ہماری بچی اپنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی، ہم نے معلوم کیا: تم یہ کیا کر رہی ہو؟ اس نے جواب دیا: ہماری استانی نے بتایا تھا کہ یہ جگہیں بڑی مقدس ہوتی ہیں، اگر راستہ میں کوئی مسجد، مندر یا کلیسا آجائے تو فوراً ہاتھ جوڑ لینا چاہئیں، اس کے ذریعہ خدا کی مدد ہوتی ہے، اور وہ راضی ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات ایک دو نہیں بلکہ دسیوں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری غفلت کے سبب ہمارے بچے اسلامی عقائد سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

فکر کی ضرورت

اگر ہم نے ایسے خطرناک حالات میں اپنی آئندہ نسل کے عقیدہ کی حفاظت کی فکر نہ کی، اس کے لیے کوششیں نہ کیں، تو ڈر ہے کہ خدا نخواستہ آخرت میں اس بات پر ہماری گرفت نہ ہو کہ ہم نے اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں کیوں بھیجا، جہاں صحیح دینی تعلیم کا نظم نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑھ کر مسلمانوں کو یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ علم کا رشتہ خالق سے مربوط کر کے علم میں ترقی کریں، اسلام کے اخلاقی نظام کو بھی قائم رکھیں، تمام دنیا کو اس علم کے ذریعہ فائدہ پہنچائیں، امت مسلمہ کو آخری وحی کے ذریعہ سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا ہے، اس لیے اس امت کا فرض منصبی یہ ہے کہ یہ امت علم کو اپنے ہاتھ میں رکھے، اس کی اصلاح کرے، اور اس کو صحیح رخ دے، اسی کے ساتھ علم کو اخلاقی نظام سے ایسا مربوط کر دے کہ دین و دنیا دونوں میں توازن قائم رہے، یہ کام اس امت کے لیے نہایت آسان ہے، اس لیے کہ اس کے پاس عقیدہ تو حید ہے، اللہ کی خشیت ہے، حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت ہے، صحابہ کرام کے نظام اخلاق کا وہ نمونہ ہے جس سے بڑھ کر دنیا کے انسانیت نے نہ دیکھا ہے، نہ دیکھ سکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے امت مسلمہ علم کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتی تو دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی ان کی خدمات ماننے پر مجبور ہوتے، اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں پڑھانے پر فخر محسوس کرتے، جہاں علم کے ساتھ نظام اخلاق بھی عطا کیا جاتا ہو، والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی جاتی ہو، پڑوسی کے حقوق کا پاس رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہو، رشتہ داروں کے نباہنے پر زور دیا جاتا ہو، انسانیت نوازی کی تعلیم سے آراستہ کیا جاتا ہو، موجودہ دور میں گرچہ عیسائی مشنریز

کے اسکول بہت ترقی یافتہ سمجھے جاتے ہیں، مگر اس حقیقت کا ہر ایک کو اعتراف ہے کہ یہاں پڑھنے والے بچے انسان کو انسان نہیں سمجھتے، ماں باپ کو گولیاں مارنے پر تیار رہتے ہیں، پڑوسی کا کوئی حق نہیں سمجھتے، گویا وہاں سے فراغت کے بعد وہ کسی درندہ یا جانور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جس کو کسی بھی انسان پر ترس نہیں آتا، خواہ وہ اس کے والدین یا اعزاء اقرباء ہی کیوں نہ ہوں، چند منافع کے حصول کے لیے وہ ہر ایک کو دھوکہ دینا جائز سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ان کو صرف خود غرضی ہی کی تعلیم دی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ایسی فحش باتیں سامنے آرہی ہیں جن کا تذکرہ بھی مناسب نہیں۔

موجودہ دور کی تعلیم

موجودہ دور کی تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جہالت کے بہت سے کاموں کو فن بنا دیا ہے، جس سے جاہلیت والا کام علم کی آڑ میں باسانی کیا جاسکتا ہے، برادر مخدوم و معظم مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی فرماتے تھے کہ آج جہالت پڑھ لکھ گئی ہے، ایک زمانہ وہ تھا کہ چور کھلے عام جیب کاٹتا تھا، لیکن آج کا زمانہ ایسا ہے کہ انسان سرعام چوری نہیں کرتا بلکہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کی کڈنیوں، گردوں اور جسم کے اعضاء چوری کرتا ہے اور اس سے اپنا بیلنس بڑھاتا ہے، کیونکہ پڑھنے کے زمانہ میں لاکھوں، کروڑوں روپے دے کر علم حاصل کیا تھا، گویا حصول علم کی راہ میں اپنی جیب کٹائی تھی، لہذا جب علم حاصل کر لیا تو پڑھ لکھ کر انسانیت کی خدمت کے بجائے ان کی جیب کاٹنا شروع کر دی تاکہ تلافی مافات کی جاسکے، اس قسم کی چوری کے واقعات اخبارات میں چھپنا عام بات ہے، یہاں یہ بھی واضح رہے کہ سماج میں صرف اسی ذہنیت کے ڈاکٹر نہیں، بلکہ ایسے ڈاکٹر بھی موجود ہیں جن کے اندر محبت کی کسک ہے، انسانیت کا درد ہے، مگر افسوس

کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرہ میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو درندہ صفت نظر آتے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی ایک تقریر میں اسی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ”آج کے نظام تعلیم نے یہ نہیں سکھایا کہ خدا کیا ہے؟ اس نے تو یہ سکھایا ہے کہ جہاں اپنی عزت کا سوال ہو، جہاں تم کو ذاتی نفع ہو رہا ہو، وہاں اس نفع کو حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن اور اپنی عزت کو نیلام کر دو، اسی وجہ سے آج انسان انسان کا سودا کر رہا ہے، آج انسان بک رہا ہے، پارٹیاں بک رہی ہیں، تیس چالیس برس کی وفاداریاں بک رہی ہیں، آج ہماری پارلیمنٹ اور اسمبلیاں نخاس کی طرح ہو گئی ہیں، جہاں خلیج بنگال سے لے کر پنجاب تک لوگ بھیڑ بکریوں اور خریوزوں کی طرح بک رہے ہیں، یہ سب اسی نظام تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے۔“ [تکبیر مسلسل، ص ۳۱۳-۳۱۴]

وقت کی اہم ضرورت

علم کا صحیح استعمال نہ ہونے کے سبب ملک کی گہڑتی صورت حال ہمارے سامنے ہے، ہر شخص اس بات کو بخوبی سمجھ رہا ہے کہ آہستہ آہستہ اس ملک میں بھی یورپین کلچر Develop ہو رہا ہے، جس کے اندر انسانیت فروشی کے سوا کچھ نہیں، لہذا ان حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا نصاب و نظام تعلیم ترتیب دینے کی طرف توجہ دیں، اللہ کا شکر ہے کہ بعض فکر مند افراد اس سلسلہ میں کوشش کر رہے ہیں، اور اس کے اچھے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، مگر ابھی اس کی ضرورت ہے کہ اس سے کہیں بڑے پیمانہ پر یہ کوششیں کی جائیں کہ علم کو دو خانوں میں تقسیم نہ کیا جائے، علم کو ایک اکائی سمجھا جائے، اور انسانیت کے لیے درپیش خطرات کو دور کیا جائے، علم کو انسانیت کے حق میں مفید بنانے کی کوشش کی جائے۔

☆☆☆☆☆

.....بقیہ صفحہ ۱۶/۱۷

اور بلندی ایک بار پھر واپس ہو، اس کے وہ حق دار بھی ہیں اور اہل بھی۔ لیکن مظلوم کے چھینے ہوئے حقوق کی بحالی کی شرط یہ ہے کہ اس کے اندر خودی اور خود اعتمادی کا احساس جاگزیں ہو، اپنی مظلومیت کا احساس ہو، ظالم کو پہچانے اور عظمت رفتہ کی واپسی کا عزم مصمم پیدا ہو تب کہیں جا کر وہ اپنے چھینے ہوئے حقوق حاصل کر سکتا ہے، حالات اور قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شعور و احساس لوگوں میں پروان چڑھ رہا ہے۔

موجودہ دور میں مسلمان جن حالات کا شکار ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو مقصدِ اصلی سے قریب کر رہے ہیں اور وہ حالات ظالموں کی شناخت کروا رہے ہیں اور ان ظالموں کی بدبختی کا سبب بن رہے ہیں، اگر حقیقت میں مسلمانوں میں یہ شعور بیدار اور پختہ ہو جائے تو یقیناً ان کے ساتھ خدا کی مدد ہوگی اور رحمت خداوندی کے جلو میں وہ زندگی گزاریں گے۔

اگر مسلمانوں کو ان کی حقیقی قوت اور حقیقی سیادت نصیب ہو جائے تو دنیا میں ایک بار پھر مسلمانوں کا پرچم لہرا سکتا ہے، ان کی عظمت رفتہ بحال ہو سکتی ہے، ان پر چھائی ہوئیں ادبار کی گھٹائیں چھٹ سکتی ہیں اور ان پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کا نور ہو سکتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے مدد کا وعدہ ہے اور یہ مدد آ کر ہی رہے گی، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وإن الله على نصرهم لقدير، الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق، إلا أن يقولوا ربنا الله ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيراً“

ولينصرون الله من ينصره إن الله لقوي عزيز، الذين إن مكناهم في الأرض أقاموا الصلاة وآتوا الزكاة وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنكر ولله عاقبة الأمور“ [سورہ حج: ۳۹-۴۱] (جن مسلمانوں سے (خواتنواہ) لڑائی کی جاتی ہے ان کو اجازت ہے) (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دئے گئے (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہوں کے) صومعہ اور (عیسائیوں کے) عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا بہت سا ذکر کیا جاتا ہے ویران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی ضرور مدد کرتا ہے بیشک خدا توانا اور غالب ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں، اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے: ”وَنريد أن نمن على الذين استضعفوا في الأرض ونجعلهم أئمةً ونجعلهم الوارثين ونمنن لهم في الأرض ونري فرعون وهامان وجنودهما منهم ما كانوا يحذرون“ [سورہ قصص: ۳-۵] (اور ہم چاہتے تھے کہ جو لوگ کمزور کردئے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنائیں اور انہیں (ملک کا) وارث کریں اور ملک میں ان کو قدرت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر کو وہ چیز دکھادیں جس سے وہ ڈرتے تھے)۔

☆☆☆☆☆

دین و علم

نئی نسل کے لیے دینی تعلیم کا نظم

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

والسلام اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں کو جو خود نبی تھے وصیت فرمائی:

”إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ“ [بقرہ: ۱۳۲] (بے شک اللہ نے تمہارے لیے دین کو پسند فرمایا ہے، اس لیے اسلام ہی کی حالت میں تمہیں موت آنی چاہیے)۔
غور کیجیے! کہ انبیاء کرام اپنے بچوں کے سلسلہ میں اس بات کے فکر مند ہیں کہ وہ دین پر قائم رہیں اور ان کو دین پر قائم رہنے کی حالت میں موت آئے، جب انبیاء کو اپنی اولاد کے بارے میں اتنی زیادہ فکر مندی تھی، تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو اس سلسلہ میں کتنا زیادہ فکر مند رہنے کی ضرورت ہے، آج ہماری نفسیات یہ ہے کہ ہم اپنی خاندانی روایات پر یقین کر کے اپنے بال بچوں کے بارے میں مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہمارے بچے اسی دین کے حامل رہیں گے، جو ہمیں ہمارے ماں باپ کی طرف سے ملا ہے۔

راقم الحروف کو متعدد مغربی ملکوں کے سفر کا موقع ملا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی ملکوں نے مذہب سے اپنا رشتہ پوری طرح توڑ لیا ہے اور اگر کوئی اپنے آپ کو عیسائی کہتا ہے تو وہ محض روایات کے طور پر ایک تہذیب کے نقطہ نظر سے، یعنی کچھ مذہبی رسوم ہیں، جو بطور عقیدہ کے انجام نہیں دیے جاتے؛ بلکہ اب وہ تہذیب اور روایت کا حصہ بن چکے ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ جو مسلمان وہاں آباد ہیں اور خاص کر گجراتی مسلمان کہ ہندوستان سے زیادہ تر وہی اس ملک میں پہنچے ہیں، ان کی نئی نسل میں بھی دین داری کا رجحان بہت ہی قابل تعریف اور لائق تحسین ہے،

رشتہ جوڑتے ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، جن کے واقعہ پر قرآن مجید میں ایک مکمل سورت ”یوسف“ کے نام سے موجود ہے اور ان کی داستان زندگی کو اللہ تعالیٰ نے ”احسن القصص“ کے نام سے ذکر فرمایا ہے، گویا حضرت یعقوب علیہ السلام کا پورا خاندان نبیوں اور رسولوں کا، باپ، چچا، دادا، بیٹا، سب اللہ کے پیغمبر ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس خاندان میں کس قدر دین داری، تقویٰ اور خشیت الہی رہی ہوگی اور گھر کے پورے ماحول پر کیسی اعلیٰ دینی فضاء سایہ فگن ہوگی، ایسے دین دار گھرانہ کے افراد سے گناہ اور معصیت کا اندیشہ بھی لوگوں کو نہیں ہوتا، چہ جائے کہ کفر و شرک کا خوف ان سے ہو؛ لیکن جب حضرت یعقوب کی وفات کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے صاحبزادوں سے سوال کیا: مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي؟ [بقرہ: ۱۳۳] (میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟)۔ صاحبزادوں نے جواب دیا: ”نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَالِاهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَاسْمَاعِيلَ“ [بقرہ: ۱۳۳] (ہم آپ کے خدا، آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے خدا یعنی ایک ہی خدا کی عبادت کریں گے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے)۔

اسی طرح سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ

قرآن مجید میں جن اولوالعزم پیغمبروں کا ذکر آیا ہے، ان میں ایک اہم ترین شخصیت حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے، جن کا مختلف عنوان کے تحت قرآن میں سولہ بار ذکر آیا ہے، ان کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام تھے، جن کا ایک نام اسرائیل بھی ہے، بنی اسرائیل دراصل ان کی اولاد ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ مصر اور عراق کے خطہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے چچا حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی خدا کے اولوالعزم پیغمبروں میں ہیں، جن کو ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی رضا کے لیے قربان کیا تھا اور عید قربان ان ہی کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے دادا ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، جنہوں نے تعمیر کعبہ کی تجدید فرمائی، حج کے زیادہ تر افعال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیوں اور فرمانبرداروں کی یاد کو تازہ کرنے کا باعث ہیں اور دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور اسلام آپ علیہ السلام کی عظمت پر متفق ہیں۔

قرآن نے خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توحید پر ایمان و ایقان کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں ابتلاؤں اور آزمائشوں میں پورا اترنے کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے؛ چنانچہ آج جو مذاہب توحید کا اقرار کرتے ہیں، وہ سبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنا

ایک ایسے ملک میں جہاں یوں محسوس ہوتا ہے کہ لباس عورتوں کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے، اور جہاں نوجوان لڑکے نت نئے فیشن کے پرستار ہیں، وہاں بھی مسلمان خواتین کی اچھی خاصی تعداد برقعہ پوش ہے، یا کم سے کم چہرہ کے علاوہ پورا جسم بشمول سر کے ڈھنکا ہوا ہے، اور نوجوان لڑکوں کے چہروں پر کثرت سے داڑھیاں ہیں اور ان کی اچھی خاصی تعداد مشرقی لباس اور اسلامی وضع قطع کی حامل ہے۔

اس کے اسباب یوں تو گھریلو ماحول اور طبعی سلامت رومی، دینی تحریکوں اور جماعتوں سے تعلق اور خاص کر حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی تحریک دعوت و تبلیغ کی محنت علماء اور مشائخ سے تعلق و ارتباط وغیرہ بھی ہے؛ لیکن سب سے اہم کردار اس میں نظام مکاتب کا ہے، ریاست گجرات میں بہت زمانہ سے ایک نظام یہ ہے کہ گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم ہیں، جو طلبہ عصری درسگاہوں میں پڑھتے ہیں ان کے لیے ان مکاتب میں پڑھنا ضروری سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی بچہ مکتب کے اوقات میں کھیلتا ہوا مل جائے تو محلہ کے لوگ بے تکلف بچہ کے سر پرست سے پوچھ بیٹھتے ہیں، کہ یہ مکتب نہیں جا رہا ہے؟ اور سر پرست کو شرمسار اور معذرت خواہ ہونا پڑتا ہے، عام طور پر مکتب کی تعلیم سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ قاعدہ بغدادی اور پارہ عم جیسے تیسے پڑھادیا جائے اور چند کلمات اور دُعائیں یاد دلادی جائیں، بس یہ کافی ہے، یقیناً کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں ہونا بہتر ہے؛ لیکن گجرات کے نظم مکاتب کی سطح اس سے بہت بلند ہے، یہاں عام طور پر میٹرک تک آٹھ دس سال مکتب کی تعلیم ہوتی ہے، روزانہ ڈھائی گھنٹہ

بچوں کا وقت لیا جاتا ہے، ایک معلم پندرہ، بیس طلبہ کو پڑھاتے ہیں، ناظرہ قرآن تجوید کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے، کچھ پارے حفظ کرائے جاتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ساتھ آیات و احادیث کے ترجمے، ایمانیات، مسائل و احکام، سیرت نبوی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور بعض جگہوں پر عربی زبان کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔

گجرات کے مسلمان تاجر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ جہاں بھی گئے مکتب کا یہ نظام بھی اپنے ساتھ لے کر گئے، اس لیے ان کی نئی نسل پر دین داری کی جھلک نمایاں طور پر محسوس کی جاتی ہے، چاہے وہ کتنے ہی مخالف اسلام ماحول میں ہوں، وہ دوسرے مسلمانوں سے اپنے دینی ربط و تعلق کی بناء پر نمایاں محسوس ہوتے ہیں، برطانیہ میں چوں کہ ۱۶ سال کی عمر تک سرکاری نصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ہر بچہ پر لازم ہے، اس لیے اتنی عمر تک بچے پابندی سے مکتب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس طرح وہ نیم مولوی تو ہو ہی جاتے ہیں اور بعض قرآن مجید کا حفظ بھی مکمل کر لیتے ہیں۔

بعض اہل بصیرت کا گمان ہے کہ ایشیاء میں جو ملک سب سے پہلے مغربی تہذیب کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا اور جو تیزی سے مغرب کی پیروی کی طرف جا رہا ہے، وہ ہمارا ملک ہندوستان ہے اور مغربی ممالک کو چوں کہ افرادی وسائل کی ضرورت ہے اور ہندوستان کے نوجوان ذہانت، صلاحیت، محنت اور فنی مہارت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کو قبول کرنے کا مزاج بھی رکھتے ہیں، اسی لیے یہاں کے کارکنان ان کے لیے سب سے زیادہ قابل قبول ہیں۔

ان حالات میں مسلمانوں کے لیے یہ ضروری

ہے کہ وہ اگلی نسلوں کو دین سے وابستہ رکھنے کے طریقہ کار پر غور کریں اور ایسا راستہ اختیار کریں کہ ہمارے بچے عصری تعلیم میں بھی آگے ہوں اور دینی پہچان بھی پوری طرح قائم رہے، اس کے لیے سب سے مفید اور آزمودہ طریقہ مکاتب کا نظام ہے، کہ زیادہ سے زیادہ مکاتب قائم ہوں، مکاتب صرف رسمی انداز کے نہ ہوں؛ بلکہ اس کا دس سالہ کورس ہو، جس میں ناظرہ قرآن، حفظ، منتخب آیات و احادیث کے ترجمے، عبادات و معاملات اور شخصی زندگی سے متعلق ضروری احکام، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کرام کی سیرت اور تاریخ ہند جیسے اہم مضامین شامل نصاب ہوں اور ان کی باضابطہ تعلیم ہوا کرے، اُردو زبان بھی اس نصاب کا ایک اہم جزو ہو اور ان طلبہ و طالبات کو اچھی طرح اُردو لکھنا اور پڑھنا آجائے؛ تاکہ وہ اپنے اسلاف کے علمی ورثہ سے جڑے رہیں، علماء کو ان کا علم، مشائخ کو ان کی دینی نسبت اور دعوتی کام کرنے والوں کو ان کی دعوتی وابستگی انھیں اپنے بچوں کی طرف سے بے پرواہ نہ کر دے اور یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ ہماری یہ دینی وابستگی لازمی طور پر ہماری آنے والی نسلوں کو بھی دین سے مربوط رکھے گی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبروں کے اُسوہ کو یاد رکھیں کہ پورا خاندان نبوت کے نور سے منور ہے، اس کے باوجود انھیں اپنی وفات کے وقت یہی فکر دامن گیر ہے کہ ہماری اولاد دین پر قائم رہے گی یا نہیں؟ ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا کبھی ہم نے اس پر غور کیا ہے؟ اور کیا ہم نے بھی کبھی اپنی اولاد سے استفسار کیا ہے: مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي؟؟

☆☆☆☆☆

مطالعہ کی اہمیت و ضرورت

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

تصنیف کے قائم مقام ہوتی ہے، کتنے ہی مصنفین ہیں جن کو ان کے قریبی رشتہ دار بھی نہیں جانتے ہیں اور اگر جانتے ہیں تو صرف ان کے اسم کو اور جسم کو جانتے ہیں اس کے علم کو اور عقل کو اور فکر و خیال کو نہیں جانتے ہیں، زمانہ جاہلیت کے ایک عرب شاعر نے کہا ہے کہ انسان کے پاس جو قوت بیان ہے اور جو فکری قوت ہے وہی اصل ہے، باقی جو ہے وہ بس گوشت ہے اور خون ہے:

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ
ولم یبق الا صورة اللحم والدم
مطالعہ کے لیے موبائل کے حد سے زیادہ استعمال پر قابو پانا بہت ضروری ہے، مطالعہ کے لیے صحیح کتابوں کا انتخاب بھی ضروری ہے اور اس کے لیے کسی صاحب علم اور صاحب ذوق کی رہنمائی بھی ضروری ہے، ورنہ کتابیں انسان کو ساحل ہدایت تک پہنچانے کا بھی کام کرتی ہیں اور کتابیں انسان کو گمراہی کے صحنوں میں بھی ڈبو دیتی ہیں، کتابوں کا معاملہ بھی دل کی طرح سے جس کے بارے میں جگر مراد آبادی نے کہا ہے:

کامل رہبر ، قاتل رہزن
دل سا دوست نہ دل سا دشمن
جس طرح ہر روز موسم کا درجہ حرارت گھٹتا اور بڑھتا ہے اسی طرح کسی شخص کا علم کا درجہ حرارت بھی گھٹتا اور بڑھتا ہے، علم کا پیمانہ وہ ڈگری نہیں ہے جو اسے مدرسہ یا یونیورسٹی سے ملتی ہے، انسان اگر کتابوں کا مطالعہ کرتا رہے تو اس کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جس دن سے مطالعہ کرنا چھوڑ دے، علم کا درجہ حرارت گرنا شروع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ انسان جہالت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے چاہے وہ انسان کتنی ہی اونچی ڈگری اپنی زندگی میں حاصل کر چکا ہو۔

☆☆☆☆☆

پہلی وحی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، اس میں پہلا لفظ ”اقرا“ تھا جس میں پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ پڑھنے والی قوم ہوتے، لیکن سروے کر کے دیکھ لیجئے، سب سے کم پڑھنے والی قوم مسلمان ہیں، دنیا کے ملکوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ عرب ملکوں میں کتابوں کے سب سے کم پڑھنے والی قوم ہے۔ ان کے گھروں میں جائے تو اللہ کی دی ہوئی آرائش کی، زیبائش کی ساری نعمتیں موجود، البتہ علم کی افزائش کا ذریعہ یعنی کتاب غائب۔ بازاروں میں کتاب کی دکانوں کے سوا ہر چیز کی دکان موجود۔ مطالعہ کا مطلب لوگ نہیں جانتے ہیں، مطالعہ دراصل دوسروں کے تجربات سے استفادہ کا اور ان تاریخ کی برگزیدہ شخصیتوں سے ملاقات کا اور ان کی گفتگو سننے کا نام ہے، سوانح عمریوں سے اور خاص طور پر خود نوشت سوانح اور سفر ناموں سے ایک قاری بہت کارآمد معلومات حاصل کر سکتا ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان کو اپنی کوتاہیوں کا اور کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے جسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان میں شعور کی چٹنگی پیدا ہوتی ہے، کتابوں کے مطالعہ سے اچھے برے کی پرکھ اور تنقید کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان میں فنی تخلیق کی اعلیٰ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے، وہ ادیب اور اعلیٰ نثر نگار اور شاعر بن سکتا ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان حیات و کائنات کے مسائل کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے، کتابوں کے مطالعہ سے انسان آفاق و انفس کی نشانیوں کو بھی زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے، اس سے انسان اپنی علم میں اضافہ کر سکتا ہے اور علم کے اظہار کی زیادہ بہتر طریقے دریافت کر سکتا ہے، کتابوں کے مطالعہ کے ذریعہ انسان حیوان ناہق (حمار) کے درجہ سے نکل کر انسان ناطق (انسان) کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے، ایک انسان جب کتاب خانہ میں داخل ہوتا ہے اور کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں کے درمیان کھڑا ہوتا ہے تو دراصل وہ ایسے شہر علم میں داخل ہوتا ہے جہاں تاریخ کے ہر دور کے علماء سے عقلاء سے اس کی ملاقات ہوتی ہے، جہاں بڑے بڑے اہل ادب کی روچیں موجود ہوتی ہیں، اس شہر علم میں اس کی ملاقات امام رازی، امام غزالی، شمسپور، برناؤشا، افلاطون ارسطو، ابن رشد سے لے کر دروید تک کے تمام اہل علم اور اہل عقل سے ہوتی ہے، کتاب خانہ ایک شہر علم ہے، کتاب خانہ میں بیٹھ کر شاہ ولی اللہ دہلوی کی حجتہ اللہ البالغہ کا مطالعہ دراصل شاہ ولی اللہ دہلوی سے براہ راست ملاقات اور استفادہ کا بدل ہے، کتاب وہ واسطہ ہے جس کے ذریعہ انسان ”حاضرات“ کے عملیات کے بغیر اسلاف کی روحوں سے ملاقات کر سکتا ہے، کسی انسان سے شخصی ملاقات سے زیادہ اہم اس کی تصنیف کا مطالعہ ہے، شخصی ملاقات سے کسی انسان کے خدو خال کو سفید و سیاہ بال کو چال ڈھال کو دیکھا جاسکتا ہے لیکن فکر و خیال کو تصنیف کے ذریعہ ہی معلوم کیا جاسکتا ہے، البتہ علمی گفتگو بھی

کام نہایت لیکن اور جاں فشانی سے کیا جائے

ڈاکٹر سراج الدین ندوی

چھڑانے اور قرض داروں کی مدد کرنے میں اور راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔“ [التوبہ: ۶۰]

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

”اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے

داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔“ [البقرہ: ۱۷۷]

مذکورہ بالا پانچوں شکلوں میں سے اس وقت

بیشتر ممالک میں ملازمت اور نوکری کی صورت رائج

ہے جو دینی، اخلاقی اور سماجی اعتبار سے جائز اور

درست ہے۔ کبھی کبھی کوئی فرد مالک نہ ہو کر کمپنی یا

ٹرسٹ مالک ہوتا ہے۔ اس میں دونوں فریق کچھ

شرائط طے کرتے ہیں۔ ایک فریق دماغی یا جسمانی

محنت کرتا ہے۔ اپنا وقت صرف کرتا ہے۔ دوسرا

فریق اس کے بدلہ میں اسے یومیہ مزدوری یا ماہانہ

طے شدہ معاوضہ دیتا ہے۔ جو لوگ یومیہ مزدوری

یا ماہانہ مشاہرہ پر کام کراتے ہیں انہیں مالک یا

ایمپلائر (Employer) کہا جاتا ہے اور جو

لوگ کام کرتے ہیں انہیں مزدور یا نوکر

(Employee) کہا جاتا ہے۔ اسلام نے

دونوں فریقوں کے حقوق و فرائض متعین کئے

ہیں۔ اس پہلے رقم ایک مضمون مزدوروں کے حقوق

پر قارئین کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ اس وقت

دوسرے فریق کے حقوق رقم کیے جا رہے ہیں۔

مالک اور آقا کا پہلا حق یہ ہے کہ جن شرائط پر

کام کرنے کا معاہدہ ہوا ہے ان شرائط کو پورا کیا

جائے۔ مالک کے مفوضہ کام کو نہایت دیانت داری

اور محنت سے انجام دیا جائے۔ اس کا حکم خوشی خوشی

بجالایا جائے۔ اس کی پسند اور مرضی کے خلاف کوئی

کام نہ کیا جائے۔ وہ جو ہدایت دے اسے خوش دلی

انسانوں کو اپنی خدمت کے لیے خرید لیتے تھے اور ان سے گھر کے تمام کام لیے جاتے تھے۔ انہیں زندگی بھر اپنے مالک کے کہنے پر ہر کام کرنا ہوتا تھا۔ انہیں غلام کہا جاتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے غلاموں کو آزادی عطا کی۔ انسانی غلامی ختم کرنے کے لیے پوری مہم چلائی۔ غلاموں کو آزاد کرنے پر بڑے اجر کی بشارت سنائی۔ اسی طرح مسلمانوں نے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا۔ بعض گناہوں کا کفارہ اسلام نے یہ قرار دیا کہ غلام کو آزاد کیا جائے۔

غلاموں کی آزادی کے لیے اسلام نے مکاتبت کا اصول مقرر کیا۔ اس کے تحت غلاموں اور مالکوں کے درمیان ایک اگر سیمنٹ ہوتا ہے مالک کہتا ہے کہ مجھے اتنی رقم دے دو میں تمہیں آزاد کر دوں گا یا غلام کہتا ہے کہ میں اتنی رقم آپ کو دوں گا۔ آپ مجھے آزاد کر دیں۔ بہر حال پیش کش کسی جانب سے بھی ہو اگر معاہدہ طے پا جاتا ہے تو پھر غلام آزاد ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

”اور تمہارے غلام اگر تم سے مکاتبت کی درخواست کریں تو اسے قبول کر لو، اور اللہ نے جو مال تمہیں دیا ہے اس میں سے اسے دو۔“ [النور: ۳۳]

اسلام نے زکاۃ کے مصارف میں ایک مدیہ بھی رکھی کہ اس رقم سے غلاموں کو آزاد کیا جائے۔

”یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز یہ گردنوں کے

انسان ایک سماجی جان دار ہے۔ سماج اور معاشرے میں رہتے ہوئے ہماری بہت سی حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ہر حیثیت میں ہمارے کچھ حقوق اور فرائض ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص، کہیں باپ ہے، کہیں بیٹا ہے، کسی کا شوہر ہے، کسی کمپنی کا مالک یا منیجر ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے باہم ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لوگ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اس کی درج ذیل شکلیں ہو سکتی ہیں:

۱- دوسروں کی ضرورت بلا معاوضہ پوری کرنا۔ اسے خدمتِ غلق کہا جاتا ہے۔ یعنی کوئی اجرت لئے بغیر انسانوں کے کام آنا۔

۲- ماہانہ یا سالانہ تنخواہ (نوکری) طے کر لینا اور متعین اوقات میں کسی کے کام کو انجام دینا۔ اسے ملازمت یا نوکری کہتے ہیں۔

۳- روزانہ متعین وقت کے اندر متعین کام کرنا اور روزانہ اجرت حاصل کر لینا۔ اسے مزدوری کہتے ہیں۔

۴- بادشاہ، نواب، صوبہ دار، قبیلہ یا بستی کے سردار عام لوگوں سے بلا اجرت کام لیتے تھے اور غریب لوگ ان کے دباؤ میں بلا معاوضہ کام کرتے تھے۔ اسے بیگاری کہا جاتا تھا۔ ملوکیت اور جاگیر دارانہ نظام کے خاتمہ پر ہمارے ملک سے یہ ظالمانہ صورت بھی ختم ہو گئی۔ البتہ ابھی بہت سے لوگ اپنے جیسے انسانوں سے غلاموں جیسا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ جسے اسلام میں گناہ قرار دیا گیا ہے۔

۵- اسلام سے پہلے ایک شکل یہ بھی تھی کہ لوگ

سے پورا کیا جائے۔ وہ جو معاوضہ دیتا ہے اپنی محنت اور لگن سے اس کا حق ادا کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب کوئی اپنے آقا کی خیر خواہی اور وفاداری کرے اور خدا کی عبادت بھی اچھی طرح کرے تو وہ دہرے ثواب کا مستحق ہوگا۔“ [بخاری و مسلم]

مالک سے وفاداری کا مطلب یہ ہے کہ مالک کی غیر موجودگی میں بھی نہایت لگن اور جاں فشانی سے کام کیا جائے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب تک مالک سر پر سرور رہتا ہے تو مزدور خوب کام کرتا ہے اور جیسے ہی مالک کسی کام سے باہر چلا جاتا ہے۔ مزدور بھی آرام کرنے لگتا ہے یا لا پرواہی سے کام کرتا ہے۔ یہ اپنے مالک کے ساتھ خیانت و بددیانتی اور اپنے معاہدہ کی خلاف ورزی ہے جو منافقت کی دلیل ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”منافق کی تین نشانیاں ہیں جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے جب وہ کوئی امانت سپرد کرے تو اس میں خیانت کرے اور جب کوئی عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔“ [مسلم]

مالک نے جو کام آپ کے سپرد کیا ہے وہ امانت ہے۔ اگر آپ اس کام کو مکمل انجام نہیں دیں گے تو آپ امانت میں خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ اسی طرح کام مکمل کرنے کے لیے جودت طے ہو جائے۔ اسی مدت میں مالک کا کام پورا کر دیا جائے۔ الا یہ کہ کوئی ایسا قابل قبول عذر لائے ہو جائے۔ بلا وجہ کام میں تاخیر کرنا بھی معاہدہ کی خلاف ورزی ہے۔

ملازمت اور مزدوری کے درمیان مالک بہت سی ایسی باتیں بتاتا ہے یا ایسے کام سپرد کرتا ہے جو اس کے راز ہوتے ہیں۔ ان رازوں کی حفاظت کرنا ملازم کی بڑی ذمہ داری ہے۔ جو شخص کسی کے راز کی حفاظت

نہیں کرتا اللہ اس کو دنیا میں بھی ذلیل کرتا ہے اور آخرت میں بھی رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس لیے مالک یا کمپنی کے رازوں کی حفاظت کی جائے اور ان کے ساتھ حد درجہ خیر خواہی کا رویہ اپنایا جائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میرے سامنے وہ تین شخص پیش کیے گئے جو جنت میں سب سے پہلے داخل ہونے والے تھے: ۱۔ شہید، ۲۔ وہ پاک دامن جو حرام و شہات سے بچتا ہے، ۳۔ وہ شخص جس نے اچھی طرح اللہ کی بندگی کی اور اپنے مالکوں کی خیر خواہی کی۔“ [ترمذی]

بہت سے لوگ درمیان میں کام کو ادھورا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں بالفاظ دیگر بھاگ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ مالک کے پیچھے اس کی برائی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ مالک کے نقصان کے درپے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ دل میں مالکوں سے بغض رکھتے ہیں۔ یہ تمام باتیں نہ شرعاً جائز ہیں اور نہ اخلاقی طور پر۔ اپنے مالکوں سے ہر حال میں خوش رہیے۔ ان کی طرف سے اگر کوئی شکایت کا موقع ملے تو اسے برداشت کر لیجیے یا ادب و احترام سے اپنے مالک سے بات کر لیجیے۔ آپ اتنی محنت سے جو حلال روزی کما رہے ہیں اسے معمولی سی کوتاہی سے حرام نہ ہونے دیجیے۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ محنت و دیانت سے حلال روزی حاصل کر رہے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”فرض عبادت کے بعد سب سے بہتر عمل اپنے ہاتھ سے روزی کمانا ہے۔“

مالک جو کام سپرد کرے، اسے بہتر سے بہتر انداز میں انجام دیجیے۔ ٹال مٹول اور کابلی و سستی کو قریب نہ آنے دیجیے۔ نہایت چستی و پھرتی اور دل کی لگن سے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیے۔ خوبصورتی

اور تندہی سے اپنے مفوضہ فرائض کو انجام دیجیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”مملوک کے لیے یہ بات بہت عمدہ ہے کہ اللہ اس کو اس حالت میں اٹھائے کہ وہ اپنے پروردگار کی عبادت اور اپنے آقا کی فرمانبرداری میں لگا ہو۔“ [بخاری و مسلم]

اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ کوئی آجریا کمپنی اپنے کسی ملازم کو اس کے عقیدے کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ مسلمان ملازمین تو اس کے پابند ہیں کہ وہ اپنے خالق کی نافرمانی کسی حال میں نہیں کریں گے۔ لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت لازم نہیں) وہ صرف معروف میں اطاعت کے پابند ہیں۔ اللہ کی نافرمانی والے کام کرنے پر وہ گناہ گار ہوں گے۔ ایسی حالت میں ایک مسلمان کو صاف صاف یہ بتا دینا چاہیے کہ جس کام کی اجازت اس کا دین نہیں دے گا اس کام کو وہ نہیں کرے گا۔ اگر کہیں ایسی نوبت آجائے اور مالک یا کمپنی زور و زبردستی کرے تو مسلمان ملازم کو نوکری چھوڑ دینا چاہیے۔ اسے اللہ کے رازق ہونے پر یقین رکھنا چاہیے۔ یہ اس کے ایمان کا حصہ ہے۔ جس عمل سے ہماری آخرت تباہ ہوتی ہو، ہماری ہمیشہ کی زندگی خطرے میں پڑتی ہو اس عمل سے باز رہنے میں ہی عافیت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب تک معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ مسلمان پر سب و طاعت لازم ہے۔ خواہ وہ پسند کرے یا ناپسند کرے۔ اگر اسے معصیت (شریعت کی نافرمانی) کا حکم دیا جائے تو نہ اس کے لیے سننا ضروری ہے اور نہ عمل کرنا۔“ [ترمذی]

☆☆☆☆☆

یاد رفتگان

مولانا سید محمد حسی ندوی علیہ الرحمہ

علم و فضل کا ایک بحر بے کراں

فیصل احمد ندوی

اجل کو لیک کہا، اور ایک پوری تاریخ اپنے ساتھ لے گئے۔ علم کا سوتا خشک ہو گیا، فضل و کمال کا آفتاب گہنا گیا، سادگی اور تواضع کا پھول مرجھا گیا، معلومات کا خزانہ بند ہو گیا، اور تاریخ کے بہت سے اسرار ہمیشہ کے لیے ان کے ساتھ دفن ہو گئے۔

مولانا سادات حسین واسطی کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ سید احمد جاجیری سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، ان کی آٹھویں پشت میں سید معین الدین احمد جاجیری نے بڑی شہرت حاصل کی۔ سانحہ ہشاہ شجاع (بن شاہ جہاں، گورنر بنگال) کی طرف سے ان کو جاگیر میں ملا تھا، پہلے یہ ضلع موگیہ میں شامل تھا، اب بیگوسرائے کے تابع ہے۔

یہیں ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں مولانا کی ولادت ہوئی۔ مولانا کے والد محترم سید فضل الکبیر علمی ودینی مزاج کے حامل بڑے زمیندار شخص تھے۔ انھوں نے اپنے یہاں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ مولانا مفتی ظفر الدین مفتاحی نے اپنی نوجوانی میں کچھ عرصہ یہاں پڑھایا ہے۔ سید فضل الکبیر صاحب آج سے ستراسی سال قبل مصر سے کتابیں منگواتے تھے۔ چھ سال کی عمر میں مولانا نے اپنے والدین اور نانی کے ساتھ پہلا حج کیا۔ ۱۹۳۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ ہوا اور ۱۹۴۸ء میں علمیت سے فراغت حاصل کی، علامہ سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور مولانا سید حبیب الحق ندوی (ڈربن) ان کے ساتھیوں میں تھے۔ ندوے میں تعلیم کے زمانے میں اور اس کے کچھ بعد تک مولانا پر علم ادب کا غلبہ رہا، وہ ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مصر جانا چاہتے تھے۔ علامہ عبدالعزیز مبین کی کوشش سے جامعۃ القاہرہ سے منظوری بھی آگئی تھی۔ جب تیاری کے لیے گھر آئے تو والدہ

ہے، بیٹھ کر اطمینان سے نماز پڑھ رہے ہیں، بلکہ چائے تک منہ سے پی ہے، دو چار روز کے بعد یکا یک غذا کے پائپ میں بلغم جمع ہو گیا، اور سانس لینے میں دشواری ہونے لگی، پھر پٹنہ لاکر ہسپتال میں داخل کیا گیا، دو چار روز کے بعد پھر سانحہ واپسی ہوئی، اب کچھ بولنے کی بھی کوشش کر رہے تھے، ہم مسلسل مولانا کے فرزند محترم سید جنید انور عرف آغا اور مولانا کے قریبی عزیز مولانا سید مختشم ندوی سے رابطے میں تھے۔ ۱۲ مارچ کو ہم نے فون کر آغا بھائی کو بتایا کہ رمضان کا مہینہ ہے، مولانا کو اچھے قاری سے قرآن سنواتے رہیے اور مولانا چوں کہ ہر وقت حدیث پڑھتے سنتے رہتے تھے، اس لیے ان کو حدیث بھی سنوائیے تاکہ کچھ سکون ملے، تھوڑی دیر بعد آغا بھائی نے واپس فون کیا کہ لیجیے مولانا سے بات کیجیے اور حدیث پڑھیے، مولانا سب سن سمجھ رہے ہیں، ہم نے سلام کیا، مولانا کی کچھ آواز آئی جو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، ہم اس وقت مسجد میں تھے، ہمارے پاس حدیث کی کتاب نہیں تھی، ہم نے صرف حدیث نیت "انما الأعمال بالنیات" پوری پڑھی، ۱۵ اپریل کو ہم نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ مولانا کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے اور بیگوسرائے لایا گیا ہے، مگر ڈاکٹروں نے مایوسی ظاہر کرتے ہوئے گھر لے چلنے کو کہا، دو دن مولانا گھر رہے اور کل ۱۸ اپریل ۲۰۲۳ء رمضان مبارک ۱۴۴۴ھ کی سترہویں (اٹھارویں) شب تقریباً گیارہ بجے داعی

ڈیڑھ مہینے سے جو کھ کالگا تھا آخر وہ حادثہ پیش آ ہی گیا، تقدیر سے کس کو مفر ہے! ۲۱ فروری کو شام (جب مولانا پٹنہ میں اپنے فرزند کے یہاں تھے) دیر تک پورے انشراح و نشاط کے ساتھ ہم سے گفتگو کی، بڑی خوشی سے ہمیں بتایا کہ فلاں کتاب ان کے پاس آچکی ہے، ہم نے ایک نہایت خوش کن بات مولانا کو بتائی تو مولانا خوشی سے جھوم اٹھے، اور ہم سے کہا آپ آجائیں، یہ منگل کا دن تھا، ہم نے ایک دن کے بعد جمعرات کا ٹکٹ بنوانے کے لیے کہہ دیا مگر ہائے! بدھ کا دن ختم ہوا بھی نہیں تھا کہ مولانا کے گھر سے فون آیا کہ مولانا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے، زبان بالکل بند ہو گئی ہے، کھانا پینا مشکل ہے، لقوہ کا اثر ہے، پٹنہ کے ہسپتال میں آئی سی یو میں داخل ہیں، میں سر پکڑ کر رہ گیا، اب سفر بھی کریں تو زیارت نہیں ہو سکے گی، اس لیے فی الحال سفر کا ارادہ ملتوی کیا گیا، اور ہم نے بہت افسوس اور دکھ کے ساتھ عرب و عجم میں مولانا کے اکثر شاگردوں کو اس کی اطلاع دی اور دعاؤں کا سلسلہ جاری ہوا، طبیعت کچھ سنبھلنے لگی، اور کچھ کچھ امید بندھنے لگی، پہلے آئی سی یو سے باہر، پھر ہسپتال سے گھر، پھر پٹنہ سے اپنے گاؤں سانحہ (ضلع بیگوسرائے) منتقل کیے گئے، ہوش و حواس پہلے سے پوری طرح قائم تھے، البتہ کمزوری بہت بڑھ گئی تھی، ہر بات سمجھتے تھے، مگر بول نہیں پاتے تھے، غذا کے لیے ناک میں پائپ لگا ہوا تھا، اب ماشاء اللہ طبیعت بہتری کی طرف مائل

مضطرب ہوگئی کہ ہمیں چھوڑ کر اتنی دور جا رہے ہو (مولانا والدین کے اکلوتے تھے) والدہ کی بے چینی کی وجہ سے مولانا نے بغیر پیس و پیش کیے مصر جانے کا ارادہ ختم کر دیا، اور علی گڑھ واپس آ کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ ندوے سے فراغت کے بعد مولانا نے علی گڑھ کا رخ کیا تھا، تاکہ علامہ عبدالعزیز مبین (ت: ۱۹۷۸ء) سے ادب اور مفتی عبداللطیف رحمانی (ت: ۱۹۵۹ء) سے حدیث کی تکمیل کریں۔ مفتی عبداللطیف صاحب اسی کے قریب زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کی صدرات سے وظيفہ یاب ہوئے تھے اور علی گڑھ ہی میں مقیم ہو گئے تھے، وہ استاد الاساتذہ حضرت مفتی لطف اللہ علی گڑھی (ت: ۲۳۳۱ھ) کے مستقل آخری تدریسی دور کے ممتاز ترین شاگرد اور حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی (ت: ۳۱۲۱ھ) کے مسٹر شد اور حدیث میں اجازت یافتہ تھے، وہ ندوۃ العلماء کے سب سے پہلے مفتی اور دارالعلوم ندوہ کے اولین مدرس تھے۔ پھر مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے صدر مدرس، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ دینیات کے صدر اور اخیر میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ دینیات کے صدر تھے۔ وہ فقہ و حدیث کے ماہر اور نہایت راسخ عالم دین تھے، (اسی پر ہماری کتاب ان شاء اللہ عنقریب شائع ہوگی) مولانا محیی صاحب بیک وقت علامہ عبدالعزیز مبین اور مولانا بدرالدین علوی (ت: ۱۹۶۵) سے ادب اور مفتی عبداللطیف سے حدیث کی کتابیں پڑھنے لگے، اس سے علم حدیث سے اشتغال بڑھا، مولانا فضل اللہ جیلانی (ت: ۱۹۷۹ء) کی صحبت نے ذوق حدیث کو ہمیز کرنے کے ساتھ اصلاح قلب کی طرف متوجہ کیا اور بالآخر انھی کے مجاز ہوئے۔ پھر مولانا حبیب الرحمن اعظمی (ت: ۱۹۹۲ء) کی طول رفاقت نے علم حدیث

اور عمومی ذوق تحقیق کو دوآشتہ کیا۔

مولانا کی شادی مولانا لطف اللہ رحمانی کی صاحبزادی (حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کی پوتی) سے ہوئی جو حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی سگی خواہر زادی ہیں، اور ابھی ماشاء اللہ حیات ہیں، مولانا کی شادی میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی بھی تشریف لائے تھے۔

ایک زمانے میں مولانا سیاست میں بھی سرگرم رہے، جمعیت علماء ہند کے اسٹیج سے پورے بہار کے دورے کیے، کچھ عرصے جمعیت علماء کے صوبہ بہار میں نائب صدر بھی رہے۔

مولانا خالص علم و مطالعے کے آدمی تھے، علمی ذوق ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، اہل نظر نے نوجوانی ہی میں مولانا کو پہچان لیا تھا، مولانا گیلانی نے مفتی ظفر صاحب کے نام خطوط میں آپ کی صلاحیتوں کا بلند الفاظ میں ذکر کیا ہے، جب کہ مولانا کی عمر ابھی بیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی، لیکن افسوس مولانا کسی مدرسے میں رہے نہ کسی علمی ادارے سے وابستہ ہوئے، اس لیے مولانا کی صلاحیتیں ہمیشہ مخفی رہیں، اور لوگوں نے مولانا کو پہچانا ہی نہیں، تاہم مولانا کے اساتذہ: مولانا عبدالعزیز مبین، مولانا بدرالدین علوی اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اپنے بعض علمی کاموں میں مولانا کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا اور بعض نے اس کا ذکر و اعتراف بھی کیا ہے۔

مخطوطات شناسی میں مولانا بڑے ماہر تھے، عابد رضا بیدار جب خدا بخش لاہوری پٹنہ کے ڈائریکٹر تھے، اس وقت انھوں نے مولانا سے خوب کام لیا، مولانا نے ہمیں بتایا کہ کتنے مخطوطات میں صفحات ادھر ادھر تھے، اور اسی طرح ان کی تجدید کی گئی تھی، اور کتنے مخطوطات

دوسروں کی طرف منسوب تھے، ہم نے بڑی محنت سے یہ سب پڑھ کر اندرونی و بیرونی شواہد سے ان کی تصحیح کی، جب بھی بیدار صاحب کو مخطوطات کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش آتی تو وہ مولانا کو بلا بھیجتے اور آپ سے مدد لیتے۔ مولانا نے متعدد گہرے علمی و تحقیقی کام کیے، بعض مخطوطات کی تحقیق کے سلسلے میں حیدرآباد میں عرصے تک مقیم رہے اور مکتبہ آصفیہ اور سالار جنگ میوزیم کی لائبریری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ مولانا نہایت بے نفس انسان تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ مزاج میں لاابالی پن تھا، اس لیے اپنے کسی کام کی اشاعت کے لیے اہتمام کیا نہ کوشش کی، اس لیے معدودے چند مضامین کے علاوہ ان کی کوئی چیز شائع نہیں ہو سکی، اور بہت سے کام محفوظ بھی نہیں رہ سکے۔

ایک واقعے سے مولانا کی بے نفسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مولانا نے خود ہم سے بیان کیا کہ انھوں نے ایک قیمتی مخطوطا ایڈٹ کیا، ایک صاحب نے ان سے لیا کہ بیروت سے اس کو شائع کریں گے، مولانا نے بتایا کہ پھر انھوں نے اپنے نام سے اس کو شائع کیا، ہم نے پوچھا کون صاحب تھے؟ کیا مخطوطہ تھا؟ مولانا نے بڑی بے نفسی سے کہا جانے دیجئے، انھوں نے شائع کیا اور کچھ پیسے کما لیے، چھوڑیے، اب اس کا ذکر کر کے کیا کریں گے، مولانا نے اس مخطوطے کا نام بھی نہیں بتایا کہ پھر ان صاحب تک رسائی نہ ہو جائے۔ مولانا کے بعض علمی کام ہمارے علم میں ہیں جن میں اکثر محنت مولانا کی ہے مگر دوسروں کے ناموں سے شائع ہوئے جن کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں۔

مولانا کے علمی کاموں کی تفصیل کے لیے مستقل مضمون کی ضرورت ہے، اس مختصر مضمون

ہے، اس پر مولانا یحییٰ صاحب سے مقدمہ لکھوانے کی شدید خواہش مند تھے، مگر یہ نہ ہوسکا۔

مولانا کی ساری معلومات مجلسوں میں کھلتی تھی، وہ نہ مدرس تھے نہ واعظ اور مقرر، وہ خاموشی سے علم و مطالعہ میں لگے رہنے والے، نہایت تحقیقی نظر رکھنے والے ایک عالم دین تھے اور صرف مجلسی آدمی تھے۔

مولانا کا علمی ذوق نہایت غیر معمولی تھا، اس سلسلے میں ہم کیا کیا باتیں لکھیں، صرف ایک واقعے سے اس کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے، چار سال پہلے

جب ندوے تشریف لائے تو ہم نے مولانا سے ذکر کیا کہ الاصابہ کا محقق نسخہ دس جلدوں میں شائع ہوا ہے (تحقیق شیخ عبداللہ بن عبدالحسن التركي)

اور ندوے کی لائبریری میں موجود ہے، مولانا پھر ٹک اٹھے، اور فوراً اس کے دیکھنے کا تقاضا کیا، ہم نے دکھایا، تو بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ اس کا

فوٹو لے لو۔ ہم نے عرض کیا اتنی جلدوں کا کیا فوٹو لیں، ہم اصل نسخہ آپ کے لیے منگوادیں گے، فرمایا پتا نہیں تب تک ہم زندہ بھی رہیں گے یا نہیں،

چنانچہ ان دسوں جلدوں کا فوٹو لیا، اور اپنے ساتھ ڈھوتے ہوئے لے گئے۔

أطراف الغرائب والأفراد للدارقطنی (تالیف ابن القیسرانی) کا ذکر آیا، ہم نے عرض کیا جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی لائبریری میں موجود ہے، کہنے لگے آپ کا بڑا احسان ہوگا اس کا فوٹو ہمیں بھجوائیے۔

کتابوں کی خرید اور فوٹو حاصل کرنے میں وہ بے تحاشا خرچ کرتے تھے، مگر ان کو سلیقہ سے رکھنے کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں تھی!۔

مولانا کے یہاں تشجیع اور ہمت افزائی بھی بہت تھی، ہماری کتاب ”امام شافعی کا علمی مقام“ جب مولانا کو پہنچی تو پڑھتے ہی ہمیں فون کیا اور

کہیں سننے یا پڑھنے میں نہ آتے۔ بالخصوص حضرت مونگیریؒ، مولانا گیلانی اور اس دیار کے علماء کے بارے میں وہ نادر معلومات رکھتے تھے۔ مولانا ولی رحمانی نے کئی دفعہ مولانا سے عرض کیا کہ حضرت مونگیری کے بارے میں آپ اپنی معلومات لکھوادیتے۔ لیکن مولانا تیار نہیں ہوئے اگر مفتی ظفر صاحب حیات گیلانی مولانا کے سامنے اور ان کے تعاون سے لکھتے تو یہ کتاب اپنی افادیت میں بہت بڑھ جاتی۔

اس سے زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز مخطوطات اور نئی نئی مطبوعات کے بارے میں ان کی واقفیت تھی، جو بھی باذوق ان سے ملا ضرور متاثر ہوا، بعض عرب علماء و محققین کو ہم نے خود دیکھا

مولانا یحییٰ صاحب اس طرح کی باتیں کرتے تو وہ حیرت سے منہ تکتے، شیخ صفوان عدنان داودی جیسے عالم و محقق نے خود ہم سے کہا کہ یہ شخص ایک دیہات میں بیٹھ کر کسی کیسی معلومات رکھتا ہے!!

شیخ صفوان عدنان داودی کے علاوہ شیخ حامد اکرم بخاری (مدینہ منورہ) شیخ احمد عاشور (مدینہ منورہ) شیخ عادل امین حرازی میمانی ندوی (مقیم قطر) شیخ محمد زیاد التکلمہ (مقیم حال انگلینڈ) شیخ خالد آل ثانی (قطر) شیخ عمر حبیب اللہ (جدہ) شیخ ماجد الحکمی (مکہ مکرمہ) سبھی مولانا کی معلومات سے متاثر تھے۔ جب پہلی دفعہ قطر گئے پانچ سال

قبل تو شیخ عادل نے وہیں سے ہمیں فون کیا کہ کیسا خزانہ آپ لوگوں نے چھپا رکھا تھا یہ تو علم و معلومات کا خزانہ ہے خزانہ!۔

ہندوستانی علماء و محققین میں مولانا ابوحنبلان روح القدس اور مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مولانا کے بڑے قدر دان تھے، مولانا کاندھلوی نے بستان لحد شین (شاہ عبدالعزیز) پر جو علمی و تحقیقی کام کیا

میں اس کی گنجائش نہیں، مولانا کے بڑے صاحبزادے محترم سید عیسیٰ صاحب نے مولانا کے سامنے تقریباً پانچ سال پہلے ہم سے کہا کہ ہم تو ابا کو مسلسل چالیس سال سے کچھ لکھتے ہی دیکھتے ہیں، معلوم نہیں یہ سب لکھا ہوا کہاں گیا، مولانا نے بے پروائی سے فرمایا: ارے یہیں کہیں ادھر ادھر پڑا ہوا ہوگا۔

مولانا کا مطالعہ نہایت وسیع اور متنوع تھا، تفسیر، حدیث، علوم حدیث، رجال، تاریخ، فقہ، ادب، لغت ہرن کی بڑی بڑی کتابیں مولانا نے پوری پڑھی تھیں، حدیث و رجال پر سب سے زیادہ

نظر تھی، فتح الباری، عمدۃ القاری، التھبید لابن عبدالبر، الجرح والتعديل لابن ابی حاتم، وغیرہ کئی کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل کتابیں انھوں نے پوری

پڑھی تھیں۔ وہ بہت سی مشہور کتابوں پر اپنی رائے رکھتے تھے۔ ان کے تبصرے گہرے مطالعے کے

غماز ہوتے تھے، کتابوں کی طرح اداروں بلکہ افراد کے بارے میں بھی نئی تلی رائے رکھتے تھے، ایک دو ملاقاتوں میں وہ لوگوں کو پرکھ لیتے تھے، اکثر

تبصرے محفوظ رکھتے اور کبھی کبھی نجی مجلسوں میں اظہار بھی کر دیتے تھے، متعدد موقعوں پر نون پر ہم سے کہا ہم تم کو ملاقات پر بتادیں گے، کبھی لوگ

پاس بیٹھے ہوں اور کسی مناسبت سے کوئی بات یاد آگئی اور لوگوں کے سامنے اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھتے تھے تو ہم سے مخاطب ہو کر کہتے ہم آپ

کو بعد میں بتائیں گے، کبھی کوئی اس طرح کی کوئی بات پوچھتا تو خوبصورتی کے ساتھ ٹال دیتے تھے

ارے اس کا کیا فائدہ چھوڑیے اپنا کام کیجیے۔ اہل علم و ادب اور اصحاب فضل و کمال اور علماء مشائخ کے بارے میں ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں، وہ ایسے ایسے واقعات و حکایات بیان کرتے جو

بہت مبارک باد دی، اور فرمایا کہ ہندوستانی لوگ اس کی کیا قدر کریں گے، عربی میں اس کو منتقل کیجیے عرب اس کی قدر داں ہوں گے۔ اس بارے میں ہم سب جانتے ہیں عربی میں بھی ایسی کوئی کتاب نہیں! اور بہت سی باتیں اس سلسلے میں ہیں جن کے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں۔

آج سے ستائیس سال قبل جب ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فضیلت اول کے طالب علم تھے، تو استاد محترم مولانا ابوجحان روح القدس ندوی کی زبانی ان کا ذکر خیر پہلے پہل سنا تھا، مولانا کبھی دوران درس کسی مناسبت سے فرماتے تھے: مولانا

صحیحی ندوی ایک بڑے فاضل پرانے ندوی ہیں۔ پھر وہ بات آئی گی ہوگی، تقریباً پندرہ سال قبل جب مولانا ندوہ تشریف لائے تو ان سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی اور ان کے فضل و کمال کی کچھ جھلکیاں ظاہر ہوئیں، اس موقع پر استاد محترم مولانا عبداللہ حسنی ندوی مرحوم نے فرمایا تھا: مولانا کو کئی دن

ندوے میں رہنا چاہیے اور علیا کے طلبہ اور اساتذہ کو ان سے مستفید ہونا چاہیے۔ اسی وقت سے ہمارا مولانا سے تعلق ہو گیا تھا، لیکن ان کے یہاں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا۔ تقریباً آٹھ سال قبل جب دوبارہ تشریف لائے تو اس وقت حدیث کی عالی

اجازتوں کے حصول کا ہمیں نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا، ہم نے مولانا کے سامنے حدیث مسلسل بالاً ولیہ اور کتب سنیہ کے اوائل پڑھ کر اجازت حاصل کی، اس وقت تک غالباً مولانا کی سند کی قیمت سے کوئی واقف نہیں تھا، پھر برادر عزیز مولوی سید طلحہ نعمت ندوی نے اجازت لی، چھ ساڑھے چھ سال پہلے ایک مناسبت سے شیخ خالد آل ثانی (قطر) کو ہمارے ذریعے سے اس کی اطلاع ہوئی، تو انھوں نے اس کو بہت غنیمت سمجھا، اور برادر معظم مولانا

رحمت اللہ ندوی (مقیم قطر) کے ذریعے مولانا تک رسائی حاصل کی اور بالآخر مولانا کو قطر کے سفر پر آمادہ کیا، مولانا تشریف لے گئے اور ان سے وہاں حدیث کی کچھ کتابیں پڑھی گئیں، پھر جلدی ہی ندوہ تشریف آوری پر ہم نے ان کی ایک مجلس حدیث انٹرنیٹ کے ذریعے نشر کی، اس کے بعد اس میدان کے شہسوار اور تازہ واردان سب ٹوٹ پڑے، اور مولانا سے اجازت حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو گئے اور اس سلسلے میں مولانا کی شہرت چہار دانگ عالم میں پہنچ گئی۔

ندوے میں مولانا نے بہت سے لوگوں کو اجازت دی، جب کوئی طالب علم الگ سے کہتا تو مولانا ہماری طرف محول کرتے اگر مولانا فیصل کہیں تو ہم تم کو اجازت دیں گے، پھر جب نو واردان بساط اجازت کے رویے سے مولانا تنگ دل ہوئے تو اس معاملے میں سختی اختیار کی۔ مولانا کے مزاج میں بڑا استغنا تھا، مختلف

ممالک کے لوگ مولانا کو بلاتے رہتے تھے، پیسوں کی پیش کش کرتے تھے، مولانا اس پر بگڑ جاتے تھے، فرماتے تھے ہم ان عربوں کو جانتے ہیں، ان کی غربت کا دور بھی ہم نے دیکھا ہے، اب پٹرول کی وجہ سے دولت آگئی ہے تو اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، یہ ہم کو خریدنا چاہتے ہیں، ہم کسی کے ہاتھ میں نہیں بک سکتے، ہماری دولت چار سو سال سے ہے، یہ ہم کو کیا دیں گے!! اس سب کے باوجود مولانا انتہائی متواضع تھے۔ سادگی کے پیکر، ان کے لباس، خدو خال، چال ڈھال اور ظاہری صورت حال سے نہ ان کے حسب نسب کا پتا چلتا، نہ دولت و ثروت کا، نہ فضل و کمال کا۔ غرض وہ مختلف خصوصیات کے حامل اور بے نظیر شخصیت کے مالک تھے:

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے

☆☆☆☆☆

مولانا انیس الرحمن قاسمی جو رحمت میں

مشہور عالم دین، صحافی و ادیب اور معلم و مربی مولانا انیس الرحمن قاسمی کا طویل علالت کے بعد مورخہ ۱۵ رجب ۱۴۴۳ھ / ۷ فروری ۲۰۲۳ء منگل کو بھاگلپور بہار میں انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن بھاگلپور میں حاصل کی، مدرسہ چشمہ فیض ادوی اور دارالعلوم منو میں ثانوی و عالی تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۵۷ء میں فارغ ہوئے، اس کے بعد درس و تدریس، صحافت و خطابت، مدارس و مکاتب کے انتظام و انصرام اور تنظیموں و جماعتوں کے ساتھ تعاون و رفاقت میں پوری زندگی گزار دی۔

مولانا مرحوم کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اس کے ذمہ داران و اساتذہ سے قلبی تعلق تھا، ہر سال دو بار ضرور تشریف لاتے، سب سے ملاقاتیں کرتے اور کچھ ایام یہاں کی فضا میں گزارتے، انہوں نے اپنے دونوں فرزندوں کو ہمیں تعلیم دلوائی، دوسرے فرزند مولانا خالد فیصل ندوی یہاں استاد ہیں، ان کے بیٹے اور جملہ شاگرد ذخیرہ آخرت ہوں گے، ان شاء اللہ۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت کرے، درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین۔

قارئین سے دعا کی درخواست ہے۔ ☆☆☆

فقہ و فتاویٰ



سوال و جواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

دینا لازم ہے۔ [فتاویٰ ہندیہ: ج ۲/ص ۸۳] **سوال:** ایک شخص نے قسم کھائی تھی کہ اپنے بھائی کی کوئی چیز نہیں لوں گا، ایک چیز کی ضرورت پڑی اور اس نے بطور قرض بھائی سے وہ چیز لے لی تو اس صورت میں کیا وہ حائث ہو جائے گا، اور کیا کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

جواب: قرض لینے کی صورت میں انسان اس چیز کا مالک ہو جاتا ہے، اس لیے اس میں وہ حائث نہیں ہوگا اور نہ کفارہ دینا ہوگا۔ [حوالہ سابق] **سوال:** ایک شخص نے نذرمانی تھی کہ میرا بچہ اگر بیماری سے صحت یاب ہو گیا تو میں ایک کوئٹل گیہوں صدقہ کروں گا، اب وہ بچہ ماشاء اللہ صحت یاب ہو گیا، اب وہ چاہتا ہے کہ گیہوں کے بجائے روپے صدقہ کر دے تو اس کی اجازت ہوگی؟

جواب: گیہوں یا اس کی قیمت دونوں میں کوئی بھی صدقہ کر دے تو نذر ادا ہو جائے گی، فتاویٰ قاضی خاں میں اس قسم کے واقعہ میں جواز کی صراحت موجود ہے۔ [فتاویٰ قاضی خاں: ج ۱/ص ۱۶۹]

سوال: اگر کوئی اپنے لڑکے پر غصہ ہو کر کہے کہ تیری کمائی میرے لیے حرام ہے اور مرنے کے بعد تم میری قبر پر مٹی نہ ڈالنا، اب اگر وہ شخص اپنے بیٹے کی کمائی کھانا چاہے تو کیا صورت ہوگی؟ اور بیٹا باپ کی وفات کے بعد کفن و دفن میں شریک ہو تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟

جواب: اگر کوئی شخص کوئی حلال چیز اپنے اوپر حرام کر لے تو اس کے حرام کرنے سے وہ چیز حرام نہیں ہوگی بلکہ اس کا استعمال اسی طرح جائز اور حلال رہے گا، البتہ قسم کھانے کی وجہ سے قسم توڑنے پر کفارہ لازم ہوگا، لہذا باپ بیٹے کی کمائی کھائے اور کفارہ ادا کرے، اور بیٹا کفن و دفن میں شریک ہو، شرعاً اس کی اجازت ہی نہیں بلکہ تاکید و ہدایت ہے۔ [شرح المشویر: ج ۳/ص ۶۳]

☆☆☆☆☆

ورزی کی ہے، کیا اس میں کوئی کفارہ ہے؟ **جواب:** اگر قسم نہیں کھائی تھی بلکہ صرف معاہدہ کیا تھا اور بلا وجہ معاہدہ توڑ دیا تو اس سے گناہ ہوا، اگر کسی خاص وجہ سے معاہدہ توڑا ہے تو گناہ نہیں ہوگا، گناہ ہونے کی صورت میں توبہ واستغفار لازم ہے، اور قسم کی صورت میں کفارہ لازم ہے، اور کفارہ کا ذکر اوپر موجود ہے۔ [ردالمحتار: ج ۳/ص ۷۲۵]

سوال: ایک شخص کی اپنی بیوی سے بحث و تکرار ہوئی اور قسم کھائی کہ سسرال کی کوئی چیز نہیں کھاؤں گا، اب خوشدامن پریشان ہیں اور وہ کھانا چاہتی ہیں، اس کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: قسم کھانے سے قسم لازم ہوگی اور اس کی صورت یہ ہے کہ سسرال سے دی ہوئی کوئی چیز کھالے تو قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کر دے، کفارہ میں دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا یا تین روزے مسلسل رکھنا ہے۔ [حوالہ سابق]

سوال: ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں فلاں دوست کی کوئی چیز نہیں کھاؤں گا، بعد میں دوست نے ایک عمدہ کھانے کی چیز ہبہ کر دی، اس نے ہبہ شدہ چیز اپنی ملک سمجھ کر کھالی تو کیا اس صورت میں وہ حائث ہو جائے گا اور قسم کا کفارہ دینا پڑے گا؟

جواب: جب دوست کی کسی چیز نہ کھانے کی قسم کھائی تو اب کھالینے سے وہ حائث ہو جائے گا، خواہ اسے ہبہ ہی کیوں نہ کر دیا گیا ہو، کیونکہ عرف و رواج میں اس قسم کی چیز دینے والے ہی کی چیز سمجھی جاتی ہے اور یہ صورت یہاں موجود ہے، اس لیے کفارہ

سوال: اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں چائے نہیں پیوں گا، اگر وہ اپنی قسم بھول گیا اور چائے پی لی، بعد میں اس کو اپنی قسم یاد آئی تو اب وہ کیا کرے؟ کیا اسے اس قسم کا کفارہ دینا پڑے گا؟

جواب: بھول کر بھی قسم کے خلاف کرنے سے قسم ٹوٹ جاتی ہے اور کفارہ دینا پڑتا ہے، اور کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو صبح و شام دو وقت پیٹ بھر کھانا کھلائے یا دس غریبوں کو کپڑے پہنائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے مسلسل رکھے۔ [ردالمحتار: ج ۳/ص ۶۲]

سوال: ایک شخص نے کسی معاملہ میں اپنے کو بچانے کے لیے جھوٹی قسم کھالی اور قرآن مجید ہاتھ میں اٹھالیا، اب وہ بے حد خوفزدہ ہے، کیا کرے؟ کیا اس کو عذاب ہوگا؟ اگر عذاب ہوگا تو اس سے بچنے کی کیا صورت ہے؟

جواب: جھوٹی قسم کھانا گناہ کبیرہ ہے، اور قرآن مجید ہاتھ میں اٹھا کر جھوٹی قسم کھانا اور بھی خطرناک ہے، آخرت میں عذاب تو ثابت ہے، اس کے علاوہ دنیا میں بھی اس کا کبھی کبھی وبال آتا ہے، اس لیے ایسے شخص کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے سچی توبہ کرے اور استغفار کرتا رہے اور اس کے وبال سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا رہے اور دعا کرتا رہے، ساتھ ہی جھوٹی قسم کھا کر جن لوگوں کو غلطی میں ڈالا ہے، ان کی غلطی بھی سچ بول کر دور کرے۔ [مجموع النہر: ج ۲/ص ۲۶۱]

سوال: دو مسلمان آپس میں کچھ معاہدے کے ساتھ کاروبار کر رہے تھے، بعد میں دونوں میں اختلاف ہو گیا، ایک نے معاہدہ توڑ دیا اور خلاف

آنکھوں میں رکھ لوں گنبدِ خضر کسی طرح

رئیس الشاکری ندوی

کر لو نبیؐ کے عشق کا سودا کسی طرح
 اس کاروبار میں نہیں گھاٹا کسی طرح
 جی چاہتا ہے جا کے مدینہ میں پڑ رہوں
 دنیا سے چھوٹ جائے جو پیچھا کسی طرح
 شادابیوں سے وادیؑ جاں معتبر کروں
 آنکھوں میں رکھ لوں گنبدِ خضر کسی طرح
 کعبہ کی عظمتوں سے ذرا ہٹ کے سوچئے
 مکہ سے کم نہیں ہے مدینہ کسی طرح
 وہ نقشِ پا جو رستے سے مجھ کو لگا گئے
 بے راہ کر نہ پائی یہ دنیا کسی طرح
 جب تک جھکاؤ دل کا نبیؐ کی طرف نہ ہو
 پورا نہ ہوگا کوئی بھی سجدہ کسی طرح
 بے چین کر رہی ہے زیارت کی آرزو
 ہو ختم زندگی کا جھمیلا کسی طرح
 رکھی خدا نے اس لیے لذتِ درود میں
 پہلے فراق میں دل شیدا کسی طرح
 کشتی کو آگ ہم بھی لگا دیتے اے رئیس
 کرتے جو پار ہجر کا دریا کسی طرح

☆☆☆☆☆

NADWATUL-ULAMA

PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)



ندوة العلماء

پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یو پی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date 10th May 2023

تاریخ ۱۰ مئی ۲۰۲۳ء

اپیل برائے تعمیر اسٹاف کوارٹرز

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسینی ندوی مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی میں اپنی علمی و دینی خدمت میں مصروف ہے، دارالعلوم اور اس کی شاخوں میں علمی و تعلیمی امور حسب معمول جاری ہیں، اساتذہ و کارکنان ندوۃ العلماء اپنی ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔ اساتذہ و اسٹاف کی کثرت کی وجہ سے دارالعلوم میں ان کی رہائش کی مزید گنجائش نہیں رہی تو احاطہ دارالعلوم کے علاوہ معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء (سکروری) میں اسٹاف کوارٹرز اور معہد سے قریب مستقل طور پر ندوہ کالونی کی سہ منزلہ عمارت تعمیر ہوئی، مگر اب بھی اسٹاف کے لیے کوارٹرز کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی، اس صورت حال کے پیش نظر پہلے ندوہ کیمپس سے متصل محلہ مکارم نگر میں اسٹاف کوارٹرز تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو الحمد للہ اہل خیر کے تعاون سے مکمل ہو گیا۔ اب کیمپس کے اندر ہی مزید کوارٹرز کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی مدد کے بھروسہ پر شروع کرادی گئی ہے، زیر تعمیر یہ عمارت تین منزلہ ہوگی، جس میں ۹ فیملی کوارٹرز ہوں گے، اس کی تعمیر پر مبلغ -/1,15,00,000 (ایک کروڑ، پندرہ لاکھ روپے) کے خرچ کا تخمینہ ہے جو ان شاء اللہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پورا ہوگا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آپ اس اہم ضرورت کی طرف فوری توجہ فرمائیں گے اور ندوۃ العلماء کے کارکنوں کا ہاتھ بٹائیں گے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ ہے کہ اس کی مدد سے یہ اہم کام تکمیل کو پہنچے گا، و ما ذلک علی اللہ بعزیز۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الحسن اعظمی ندوی	(مولانا) جعفر مسعود حسینی ندوی
معمتد تعلیم ندوۃ العلماء	معمتد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

نوٹ: چیک/ڈرافٹ صرف یہ ہیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتے پر ارسال کریں

NIZAMAT NADWATUL ULAMA

Nizammat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lucknow - 226007 (U.P.)

مطیباں کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91 - 8736833376

پر مطلع فرمانے زحمت کریں، اس سے دفتری کارروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

NADWATUL ULAMA

STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW
(IFSC CODE : SBIN0000125)

تعمیرات

A/c. No. 1086 3759 733

ONLINE DONATION LINK

<https://www.nadwa.in/donation/>

website : www.nadwa.in
Email : nizammat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا